Scanned by CamScanner

Pakmcqs.com.pk

Scanned by CamScanner

راوی پار

(افسانے)

گلزار

مکتبہ استعارہ

۲۴۸، غفار اپارٹمنٹس، غفار منزل ایکسٹینشن
استعارہ لین، جامعہ نگر، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

Scanned by CamScanner

© گلزار

RAAVI PAAR
(Urdu Short Stories)
by
Gulzar

نام کتاب	:	راوی پار
مصنف	:	گلزار
پتہ	:	بوسکیانہ، پالی ہل، باندرہ، ممبئی
تعداد	:	۱۰۰۰
سالِ اشاعت	:	۲۰۰۱
کمپوزنگ	:	محمد اکرام خان
طابع	:	پرنٹ سینٹر، دریا گنج، نئی دہلی۔۲
زیر اہتمام:		استعارہ، ۲۴۸- غفار اپارٹمنٹس، غفار منزل ایکسٹینشن
		استعارہ لین، جامعہ نگر، نئی دہلی۔۱۱۰۰۲۵
		ٹیلی فون: ۶۳۱۸۱۲۶
		ای میل: istearа001@rediffmail.com
قیمت		Rs.150.00

تقسیم کار:

- مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی، ممبئی، علی گڑھ
- بک امپوریم، سبزی باغ، پٹنہ
- الکتاب، یتیم خانہ کمپلیکس، آرریا
- مکتبہ دین و ادب، امین الدولہ پارک، لکھنؤ
- آزاد کتاب گھر، ساکشی بازار، جمشید پور
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں دہلی
- مکتبہ سیاست، جواہر لال نہرو روڈ، حیدر آباد

Scanned by CamScanner

انتساب

جناب احمد ندیم قاسمی کے نام

بابا!
آپ نے جس افسانے کو
انگلی پکڑ کے
کھڑا کیا
وہ اب چلنے لگا ہے—!

—گلزار

Scanned by CamScanner

ترتیب

- گلزار کی کہانیوں میں زندگی کی کتاب ۷
  [ڈاکٹر گوپی چند نارنگ]
- خوشبو، جل پریاں، عینک اور پانچ ہزار سال ۱۵
  [محمد صلاح الدین پرویز]
- ہوا یوں کہ... ۱۸
  [عرض مصنف]

افسانے

- بملدا ۲۱
- سن سیٹ بولیوارڈ ۲۸
- مائیکل اینجلو ۳۲
- کس کی کہانی ۳۶
- ادھا ۳۹
- ایک چابی ۴۳
- دس پیسے اور دادی ۵۲
- ڈلیا ۵۶

Scanned by CamScanner

- خوف ۶۳
- سانجھ ۶۶
- مرد ۷۰
- راوی پار ۷۳
- فصل ۷۷
- دھواں ۸۲
- تقسیم ۸۶
- نجوم ۹۳
- نووارد ۹۶
- گڈی ۹۹
- خیرو ۱۰۲
- لیکن ۱۰۶
- اونچی ایڑی والی میم ۱۱۱
- زندہ ۱۱۷
- ہاتھ پیلے کردو ۱۱۹
- کاغذ کی ٹوپی ۱۲۳
- حساب کتاب ۱۲۸
- آگ ۱۳۱
- جنگل نامہ ۱۳۷
- گلزار کا تخلیقی کولاژ ۱۵۱

Scanned by CamScanner

پروفیسر گوپی چند نارنگ

گلزار کی کہانیوں میں زندگی کی کتاب

فلم کی دنیا بھی عجیب چکا چوند کی دنیا ہے جس میں آنے کا دروازہ تو ایک ہے لیکن جانے کے دروازے کئی ہیں۔ پوپ کلچر Pop culture کا زمانہ ہے۔ لوگ دیکھتے ہی دیکھتے ایسی بلندیوں تک پہنچ جاتے ہیں کہ نگاہ نہیں ٹھہرتی اور پھر غائب بھی ایسے ہوتے ہیں گویا تھے ہی نہیں — لیکن کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ برسوں کی ریاضت کے بعد نمایاں ہوتے ہیں، اپنی جگہ رہ رہ کے چمکتے ہیں اور گم کردہ رہوں کو راہ دکھاتے ہیں۔ دنیا بہت بدل گئی ہے، دنیا کی سچائیاں بھی بدل گئی ہیں لیکن کچھ نہیں بھی بدلیں، مثلاً لکشمی اور سرسوتی کے معاملات۔ ہر چند کہ لکشمی اب سیاست دانوں کے نرغے میں ہیں اور سرسوتی وینا لیے اکیلی بیٹھی ہیں۔ تاہم بعض وضع داریاں جوں کی توں چلی جاتی ہیں یعنی ایک عرش نشین ہے تو دوسری فرش نشین۔ عام قاعدہ یہی ہے کہ ایک کی توجہ ہو جائے تو ہو جائے، دونوں ایک ساتھ مہربان ہوں یہ آسان نہیں۔ البتہ اگر تپسیا میں کھوٹ نہیں، اور ریاضت پکی اور لگن پکی ہے تو پھر اچنبھا سا اچنبھا ہوتا ہے۔ ایسا ہی اچنبھا گلزار کی ذات ہے۔ ادھر چند برس پہلے جب ''فنون'' لاہور میں ان کی تخلیقات منظر عام پر آنے لگیں اور ہر چند کہ میں احمد ندیم قاسمی کی نظر کا قائل ہوں اور جانتا ہوں کہ کیسے کیسوں کو انہوں نے کندن بنا دیا، لیکن گلزار چونکہ شہرت اور گلیمر کی راہ سے چل کر آئے تھے، ان کی چیزوں کو میں نے ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا، لیکن جیسے جیسے پڑھتا گیا میری خوشگوار حیرانی میں اضافہ ہوتا گیا اور اب ان کہانیوں کو یکجا پڑھا ہے تو مزید اچنبھا ہوا۔ آپ کو اچنبھا ہو یا نہ ہو، تب بھی کم از کم آپ وہ نہیں رہیں گے جو آپ پہلے تھے۔

گلزار کے فنکار ہونے میں شبہ نہیں۔ لیکن فن اور فن میں فرق ہوتا ہے اور ہر فن کے تقاضے الگ ہیں۔ ضروری نہیں کہ ایک زمرے کا فنکار دوسرے زمرے میں بھی اتنا ہی کامیاب ہو۔ فلم کی شہرت اپنی جگہ، گلزار کہانی کے فن میں ایسے کھرے نکلیں گے، اسکا سان گمان بھی نہیں تھا۔ ادب کے بہت سے معاملات عشق کی طرح ہیں۔ ان میں منصوبہ بندی یا فارمولا سازی نہیں چلتی، بلکہ بہت کچھ غیر ارادی بلکہ اضطراری طور پر ہوتا ہے اور اس میں شعوری سعی کو اتنا دخل نہیں ہوتا جتنا باطنی تحرک

Scanned by CamScanner

کو۔ بعض لوگ دیر سے لکھنا شروع کرتے ہیں۔ یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں ہے، پھر بھی فن کی دیوی کو رام کرنے کے لیے ریاضت شرط ہے۔ میرا خیال ہے گلزار شروع ہی سے کہانیاں لکھتے رہے ہوں گے۔ اپنی باطنی ضرورت کے تحت اور اس سے تسکین پاتے رہے ہوں گے، جب لکھنا داخلی وجدانی تسکین کا ذریعہ بن جائے، کسی خارجی حصول یا یافت کا نہیں تو اس میں لامحالہ تخلیقی کاوش کا رنگ آنے لگتا ہے اور فن کے تقاضوں کا احساس ہو تو سونے پر سہاگہ تب تخلیقی کاوش، ادب کا درجہ پانے لگتی ہے۔ میں جیسے جیسے ان کہانیوں کو پڑھتا گیا، ان کی ادبی حیثیت کے بارے میں گمان خوشگوار یقین میں تبدیل ہوتا گیا۔ رائے لکھنے کے لیے اکثر ساری چیزوں کو پڑھنا ضروری نہیں ہوتا۔ بالعموم جب اندازہ ہونے لگے کہ باقی سب بھی ایسا ہی ہے۔ لیکن گلزار پُرفریب فنکار ہے، ہر قدم پر جل دے جاتا ہے۔ ہر کہانی کے ساتھ زندگی کا اور زندگی کے تجربے کا افق بدلتا ہے اور وسیع سے وسیع تر ہوتا جاتا ہے۔ اکثر فلم والوں کو دیکھا ہے کہ جب لکھتے ہیں تو رومانس اور فارمولا سے باہر کم ہی قدم رکھ پاتے ہیں یعنی گھوم پھر کر وہی فضا جس میں ان کی زندگی گزری ہے۔ ان کے ذہن کو رومانی موضوعات سے ایک جکڑ سی پیدا ہو جاتی ہے جو اولین گناہ کی طرح ان سے چپک جاتی ہے اور وہ ہرگز اس سے اوپر نہیں اٹھ سکتے۔ لیکن گلزار کے یہاں تعجب ہوتا ہے کہ مصنف اِس Wave Length یا اُس Wave Length کا خالق نہیں ہے۔ ان کے یہاں ہر کہانی کے ساتھ زندگی کا ایک نیا روپ، ایک نیا رخ، ایک نئی سطح نظر آتی ہے، ایک نیا زاویہ، ایک تجربہ۔ ایک ایسے ذہن و شعور کا پتہ دیتا ہے کہ اسکا لگاؤ اس رخ یا اس رخ سے نہیں، بلکہ زندگی کی پوری سچائی سے ہے یا زندگی کے اس کھلے ڈلے تجربے سے جو حدیں نہیں بناتا، حصار نہیں کھینچتا، رشتوں، طبقوں، نفرتوں اور محبتوں میں کسی ایک پرت پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ سچائیوں کے آر پار دیکھتا ہے اور زندگی کو اس کے پورے تنوع، بوقلمونی اور تجربے کو اس کی تمام جہات کے ساتھ انگیز کرتا ہے۔ کسی بھی فن کار کے لیے یہ کمال معمولی نہیں۔ غالب نے باجے کو راگوں سے بھرا ہوا کہا تھا۔ گلزار کی کہانیوں کو ذرا سا چھیڑنے کی ضرورت ہے، زندگی کے سُر، ان میں سے نکلنے لگیں گے۔ ایک ایسے فن کار کے لیے جس نے ساری زندگی فلم سازی میں کھپا دی۔ یہ کارنامہ معمولی نہیں کہ اس نے ایسی کہانیاں لکھیں جن میں زندگی کا سنگیت بھرا ہوا ہے اور ہر کہانی میں زندگی کا ایک الگ روپ، الگ تجربہ سامنے آتا ہے۔

آیئے ان کہانیوں میں سے بعض پر ایک نظر ڈالیں۔ ''اڈھا'' اور 'خیرو' اس لحاظ سے بہت مزے کی کہانیاں ہیں کہ ان میں جو کردار وضع کیے گئے ہیں، وہ عام نوعیت کے نہیں ہیں۔ اڈھا کو سب اڈھا کہہ کر بلاتے ہیں، نہ پورا نہ پونا، بس اڈھا۔ قد کا بونا تھا لیکن سب کے کام نمٹا دیتا۔ خود

Scanned by CamScanner

چھوٹا تھا مگر کوئی کام اس سے بڑا نہ تھا۔ رادھا کملانی کو کالج سے لوٹتے ہوئے جب غنڈوں نے چھیڑا تو ادھا ہی اسے بچا لایا۔ پھر بھی سب اسے مرد آدھا سمجھتے۔ رادھا بھی اسے آدھا سمجھتی۔ تب اس نے ستیہ سے ناتا جوڑ لیا جو وہیں فلیٹوں میں پیشہ کرتی تھی۔ ادھے کی مردانگی کا امتحان تو جب ہوا جب ستیہ کے حرامی بچہ ہونے کی خبر اڑ گئی اور سب نے فلیٹوں سے اس کو نکال دینے کی ٹھان لی۔ ادھا سینہ تان کر کھڑا ہو گیا اور آگے بڑھ کر اس نے بچے کو گود لے لیا۔ گویا دنیا جس کو ادھا کہہ کر مذاق اڑاتی تھی وہی پورا نکلا، مکمل انسان۔ اسی طرح خیرو بھی ایک گرا پڑا کردار ہے جس کی کسی کی نظر میں کوئی وقعت نہیں۔ وہ بیکار کے کام کرتا رہتا ہے، بیلوں کو گھنٹیاں باندھنا، سینگ رنگنا، سجانا سنوارنا، مٹکیوں پر نقش و نگار بنانا، چوپال پر گانا بجانا یعنی زندگی کا یہ وہ جمالیاتی پہلو ہے جو بظاہر غیر افادی ہوتا ہے۔ گاؤں والوں کے نزدیک اس کی سب حرکتیں نکمی تھیں۔ لوگ سمجھتے کہ وہ فالتو کے کاموں میں لگا رہتا ہے۔ کب تک مفت کی بٹورتا، بھوکا رہنے لگا، بیمار ہوا، مر گیا، تب گاؤں والوں کو احساس ہوا جیسے کوئی بڑی کمی آ گئی ہو۔ وہ جو بے کام کے کام کرتا تھا، زندگی کے رنگ و نور میں اس کا کتنا بڑا حصہ تھا۔

ایک کہانی 'مرد ماں' بیٹے کے رشتے پر ہے۔ ماں باپ میں طلاق ہو چکی ہے۔ نوجوان بیٹا ہوسٹل میں ہے۔ ماں کا تعلق کسی دوسرے شخص سے ہو جاتا ہے۔ بیٹا چھٹیوں میں گھر آ رہا ہے، ماں اس کو بتا دینا چاہتی ہے کہ وہ حاملہ ہے اور کچھ مدت میں اس شخص سے شادی کر لے گی۔ لیکن بیٹا جس کو ماں ہنوز بچہ سمجھتی تھی آتے ہی بھانپ جاتا ہے اور اس کے اندر کا مرد چیخ اٹھتا ہے، "کس کا بچہ ہے، باسٹرڈ" گویا بیٹا نہیں باپ بول اٹھتا ہے یا بیٹا باپ کی انا کا قائم مقام ہے یا ہمارے 'ذکر مرکز سماج' میں سارے حقوق مرد کے ہیں یا یہ کہ ماں باپ بچوں کو کتنا ہی بچہ سمجھتے رہیں، بچے کتنی جلد اندر ہی اندر بڑے ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور مزے کی کہانی بچے اور دادی کے رشتے پر ہے جو دس پیسے چرانے پر دادی کی ڈانٹ کھاتا ہے اور گھر سے بھاگ جاتا ہے۔ ٹرین پکڑتا ہے اور دس پیسے مٹھی میں دبائے رات کے خوف سے راستے کے کسی اسٹیشن پر اتر جاتا ہے، اکیلا اور بے سہارا ہے۔ صبح جاگتا ہے تو دیکھتا ہے کہ رات بھر وہ ایک بوڑھی بھکارن سے گلے لپٹ کر سوتا رہا جو مر چکی ہے۔ لوگ جمع ہوتے ہیں اور اس کے کفن دفن کے لیے چندہ جمع کرنے لگتے ہیں۔ بچے کو دادی کی یاد آتی ہے، وہ سکہ کٹورے میں پھینکتا ہے اور بھاگتا ہے۔ گھر کی طرف دادی کی تلاش میں۔ گلزار نے بچے کے جذبات کی ترجمانی تو کی ہی ہے، ساتھ ہی اس حقیقت کی بھی کہ جب ہم چیزوں کو گنوا دیتے ہیں تو ان کی قدر پہچانتے ہیں، یا گنوانا اور پانا دونوں ایک ہی سچائی کے دو رخ ہیں۔

گلزار کی کہانیاں جیسے کہ کہا گیا زندگی کی ہمہ جہت بوقلمونی کا نگار خانہ ہیں جن کی تشکیل میں

Scanned by CamScanner

سچائی کی تہہ تک اترنے والی نظر کی کارفرمائی ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان میں عام انسانوں کے عام رشتوں کی کہانیاں بھی ہیں جن میں کوئی خاص پہلو ہے اور گرے پڑے نظر انداز کیے گئے لوگوں کی کہانیاں بھی، جن میں انسانیت کا درد ہے، اسی طرح راجاؤں مہاراجاؤں، ٹھاکروں اور راجپوتوں کی بھی، نیز ڈاکوؤں کی یا پھر ایسی کہانیاں بھی جن میں فینٹسی کا عنصر ہے یا وہ جس کو آج کل جادوئی حقیقت نگاری Magic Realism کہا جارہا ہے۔ ایک مختصر مضمون میں ان سب پہلوؤں کا احاطہ کرنا تو ممکن نہیں، البتہ بعض کہانیوں کے ذکر کے بغیر بات پوری بھی نہیں ہوسکتی۔ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ گگزار کے کرداروں میں ادنیٰ اعلیٰ چھوٹے بڑے ہر طرح کے لوگ ملیں گے، عورتیں، مرد، بوڑھے، بچے، جوان، سب اپنے اپنے اعمال و اطوار کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ 'سانجھ' ایک بوڑھے لالہ اور اس کی بڑھیا لالائن کی کہانی ہے جس میں لالہ کو اس بات کا دکھ گھلا ڈالتا ہے کہ لالائن نے سمدھن کی دیکھا دیکھی بال کٹوا دیے اور بوڑھے لالہ سے پوچھا بھی نہیں۔ بڑھاپے کے جذبات اور احساسِ تفاخر پر یہ کہانی پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ ایک اور کہانی میں یہی احساسِ تفاخر غیرت نفس کا مسئلہ بن جاتا ہے اور منفرد معنیاتی قوس قزح بناتا ہے۔ 'زندہ' میں راجہ صاحب کے اکلوتے بیٹے کو جو اپاہج ہے، یہ بات پسند نہیں کہ لوگ اس پر ترس کھائیں کیونکہ وہ اپنی قوتِ ارادی کے بل پر زندہ رہنا چاہتا ہے کہ ''میرے انگ مجھ سے ہیں میں اپنے انگوں سے نہیں'' لیکن جب راجہ صاحب اس کی شادی کردیتے ہیں تو وہ تاب نہیں لاسکتا کیونکہ پہلے جب لوگ ترس کھاتے تھے تو اس کی قوت ارادی کو شہ ملتی تھی، وہی لوگ اب اس پر ہنسنا شروع کرتے ہیں تو گویا اسکو اپاہج بننا قبول ہے لیکن مضحک بننا قبول نہیں۔ دونوں صورتیں وجودی ہیں، لیکن پہلی سے فرار ممکن ہے، دوسری سے نہیں، اسی لیے دوسری صورت جان لیوا ہے۔ اونچے گھرانے کی کہانیوں میں بھی اصل پہلو انسانی صورتِ حال کا ہے۔ یہی معاملہ غریب غربا، ناداروں، کامگاروں کی کہانیوں کا ہے۔ دو کہانیوں میں دھوبیوں کی گھریلو زندگی کا بڑا جیتا جاگتا نقشہ ہے۔ 'اونچی ایڑی والی میم' دراصل بخشش میں دی ہوئی سائیکل ہے۔ جو جھبا اور مہکو کے درمیان وجہ عداوت بن گئی ہے۔ کہانی اس واقعہ کے گرد گھومتی ہے کہ سیٹھوں کی جھوٹی مراعات کس طرح معصوم زندگیوں میں زہر کے بیج بودیتی ہیں، نتیجتاً مہکو جھبا کو نیچا دکھانے کے لیے بیوی کا زیور چوری کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ ایک اور کہانی 'ہاتھ پیلے کردو' میں کھاڑی کے دھوبیوں کا المیہ ہے۔ اس کی ساخت میں ایک خوبصورت دائروی عمل ہے کہ جو کچھ جوانی میں مالتی کے ساتھ ہوا، وہی اب مالتی کی جوان بیٹی کے ساتھ ہونے جارہا ہے۔ جوانی میں مالتی کا عاشق ڈرائیور رام ناتھ پکڑا گیا اور دھوبیوں نے مل کر اسے مار ڈالا۔ اب جو مالتی کی بیٹی جوان ہوگئی ہے اور

Scanned by CamScanner

رات میں جب کھاڑی ہائی ٹائڈ سے بھر جاتی ہے اور ہارن کی پیں پیں سنائی دیتی ہے تو کھانا پروستے ہوئے اچانک مالتی کے ہاتھ رک جاتے ہیں۔

گلزار کی بعض کہانیوں میں عورت مرد کے رشتوں اور خود فریبیوں کے ٹوٹنے کا عمل ہے۔ انسان ان خود فریبیوں کو دعوت دیتا ہے اور باہمی رشتوں میں ان خود فریبیوں کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ اکثر یہ فریب ٹوٹ جاتے ہیں، لیکن لاشعور میں کہیں نہ کہیں ان کا طلسم بنا رہتا ہے اور مرد عورت اس کے سہارے زندہ رہتے ہیں، حتی کہ ایک دن حقیقت کا بے رحم چہرہ سامنے آتا ہے اور ہم پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

بعض دلچسپ کہانیاں ایسی بھی ہیں جن میں متوسط طبقے کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی نفسیاتی گرہیں ہیں۔ 'کاغذ کی ٹوپی' میں سن بلوغ کو پہنچنے والے کرداروں کا تصادم ہے جو بظاہر مغائرت کا پہلو رکھتا ہے لیکن در پردہ ان دھڑکنوں کا پتہ دیتا ہے جو دو دلوں کے ایک دوسرے کی طرف کھنچنے لیکن انا کے ہاتھوں اقرار نہ کرنے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ اسی طرح 'گڈی' میں سابقہ دو بہنوں کا ہے جن میں چھوٹی بڑی پر سبقت لے جانا چاہتی ہے، رفتہ رفتہ یہ معصوم نفسیاتی خواہش گہرے حسد کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس میں اس محبت کی قلعی بھی کھولی گئی ہے جو آج کل کے نوجوان لڑکے لڑکیوں کو فلم ایکٹروں سے ہو جاتی ہے اور پھر ذرا سی بات پر بھرم ٹوٹ بھی جاتا ہے جو خاصا صدمہ زا ہوتا ہے۔ خیالی توقعات کا ٹوٹنا 'نو وارد' میں بھی ہے کہ اخباروں کی پیش گوئیاں پڑھ پڑھ کر اکثر لوگ سہانی توقعات قائم کر لیتے ہیں۔ اکثر لوگ ان کی تطبیق شادی بیاہ پر بھی کرتے ہیں اور پھر صدمات سے دوچار ہوتے ہیں۔ ان کہانیوں میں روز مرہ کے واقعات اور زندگی کے مضحک پہلو ہیں جن کو لوگ سنجیدہ سمجھ لیتے ہیں اور پھر مشکل میں پڑ جاتے ہیں۔

توقع کی جا سکتی ہے کہ گلزار نے بہت سے واقعات اور کردار فلم کی دنیا سے لیے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہے، فقط دو کہانیوں کا تعلق فلمی ہستیوں سے ہے، لیکن یہ کہانیاں بھی ایک پرت کی رومانی کہانیاں نہیں بلکہ بعض جینوئن آرٹسٹوں کی زندگی میں جو گہرا دکھ اور تہہ نشیں المیہ ہوتا ہے، یہ کہانیاں اس درد پر مبنی ہیں اور ان میں حقیقت اور فینٹسی کا کچھ ایسا تال میل بھی ہے کہ بیانیہ کا وہ طور متشکل ہوتا ہے جس کو جادوئی حقیقت نگاری کا نام دیا جا سکتا ہے۔ یہ کہانیاں ہیں 'بملدا' اور 'سن سیٹ بولیوارڈ'۔ بملدا یعنی بمل رائے الہ آباد میں تروینی کے سنگم پر جہاں گنگا جمنا اور سرسوتی ملتی ہیں اور ہر بارہ سال کے بعد جب سورج کے گرد گھومتے ہوئے نو سیارے ایک سیدھ میں آ جاتے ہیں اور سورج کی پہلی کرن سنگم پر پڑتی ہے تو کمبھ کا میلا لگتا ہے جس میں نواں دن جوگ اشنان کا دن مانا جاتا ہے۔ بملدا کمبھ پر فلم بنانا چاہتے تھے جو شروع تو ہوئی لیکن مکمل نہیں ہوئی حتی کہ بارہ برسوں کے

Scanned by CamScanner

پورا ہوتے ہوتے خود بملدا کی جیون یاترا عین اسی دن پوری ہوگئی جب جوگ اشنان کا دن تھا۔ دوسری کہانی چارولتا ایک بجھ چکے ستارے کے بڑھاپے کی کہانی ہے۔ وہ سن سیٹ بولیوارڈ کی مشہور زمانہ کوٹھی میں جو عظمت رفتہ کا نشان محض رہ گئی ہے، پرانی یادوں کے سہارے زندہ ہے لیکن پیشتر اس کے کہ یہ یادیں بھی چارولتا سے چھن جائیں اور کوٹھی کا سودا ہو جائے، خریدار کے وزیٹنگ کارڈ کو ہاتھ میں دبائے وہ دم توڑ دیتی ہے۔ دونوں کہانیوں میں المناکی کے سائے ہیں اور زندگی کی کامرانیوں اور جگمگاہٹ سے دور، دونوں میں عدم تکمیل کا دکھ سرسراتا ہے۔

خالص فینٹیسی کی مثال 'واہمہ' ہے۔ خود گلزار کو یقین نہیں کہ اس کو کیا نام دیں، پہلے اس کا نام 'واہمہ' تھا، بعد میں 'لیکن' کر دیا گیا۔ شاید اس لیے کہ اس میں جو واقعہ ہے اس پر حقیقت کا گمان ہوتا ہے لیکن وہ حقیقت نہیں بلکہ حقیقت اور غیر حقیقت کا وہ تصور ہے جسے ہم بالعموم قبول کر لیتے ہیں۔ گلزار نے اس کہانی کے ذریعے حقیقت کے معمولہ تصور پر سوالیہ نشان لگایا ہے اور مدلل ہے کرشنا مورتی کے تصور حقیقت سے جو وجود، عدم کے فرق کو ذہن انسانی کا کرشمہ کہتا ہے۔ اس کہانی میں ریل سے ایک آدمی کے کٹ کر مر جانے کا ذکر ہے۔ اسٹیشن پر ریل اب نہیں آتی، پلیٹ فارم، پٹریاں، سگنل سب سنسان ویران پڑے ہیں۔ لیکن ہر شام راوی کو ایک آدمی دیوراج ملتا ہے جو پٹریوں پر چلنے سے منع کرتا ہے کہ دیکھتے نہیں گاڑی آرہی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ اس کا جوان بیٹا شیام گاڑی سے کٹ کر مر گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد دیوراج کا آنا بند ہو جاتا ہے۔ راوی اس کی خیریت پوچھنے اس کے گھر جاتا ہے تو جو شخص دروازہ کھولتا ہے وہ اس کا بیٹا شیام ہے۔ شیام بتاتا ہے اس کا باپ دیوراج تو تین سال پہلے اسٹیشن پر گاڑی کے نیچے کٹ کر مر گیا تھا۔ کہانی کے بین السطور میں کرشنا مورتی کے اقوال کا تجسس چلتا رہتا ہے کہ سب واہمہ ہی تو ہے، حقیقت فقط اس قدر ہے کہ جس قدر ہم قبول کر لیتے ہیں ورنہ زندگی یا موت دونوں واہمے ہیں۔

گلزار کے تخلیقی کینوس کے صحیح اندازے کے لیے ان کہانیوں کا ذکر بھی ضروری ہے جن کا مرکز ومحور مذہبی جنون، دہشت گردی یا خوف و ہراس ہے۔ یہ کہانیاں بھی اتنی ہی منفرد ہیں جتنی بعض دوسری، فسادات کے موضوع پر بلا مبالغہ ہزاروں کہانیاں لکھی گئی ہوں گی، گلزار کی کہانیاں سب سے الگ ہیں اور اپنی مثال آپ۔ کہانی 'خوف' میں اس دہشت کی عکاسی ہے جو مذہبی جنون کی فضا میں ذہن کو مفلوج کر دیتی ہے۔ اس میں بمبئی کی لوکل ٹرین میں سفر کرنے والا یاسین جس کی بیکری جلائی جا چکی ہے اور جو پانچ دن تک ادھر اُدھر چھپنے اور جان بچانے کے بعد لوکل ٹرین سے ڈرتا بچتا گھر جا رہا ہے، ڈبے سنسان ہیں، اچانک دیکھتا ہے کہ ایک سایہ ڈبہ میں داخل ہوا اور تاک میں کھڑا ہو گیا۔ یاسین کو ڈر ہے کہ وہ شخص کوئی غیر ہے جو اسے مار ڈالے گا۔ موقع پاتے ہی یاسین "یا علی"

Scanned by CamScanner

کہتے ہوئے اس کو ٹانگوں کے بیچ سے اٹھا کر چلتی ٹرین سے باہر پھینک دیتا ہے۔ اس کے بعد گلزار نے صرف ایک جملہ لکھا ہے جو کہانی کی جان ہے۔ ''نیچے گرتے آدمی کی چیخ سنائی دی — اللہ'' اس کہانی کا شمار فسادات پر لکھی ہوئی موثر ترین کہانیوں میں ہو سکتا ہے کہ کس طرح مذہبی جنون خود اپنی سچائی کی نفی کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ایسی ہی ایک منفرد اور دردناک کہانی ہے ''راوی پار'' جس میں درشن سنگھ اپنی بیوی اور نوزائیدہ دو جڑواں بچوں کے ساتھ 'نانک نام جہاز ہے' کے سہارے گردوارے کے اکھ سے نکل کر بھیڑ بھاڑ میں اسپیشل ٹرین کی چھت پر چڑھ جاتا ہے۔ دونوں بچے ماں کی سوکھی چھاتیوں کو چوڑے رہتے ہیں۔ نہ دودھ نہ پانی، دوران سفر ایک بچہ مر جاتا ہے۔ جب ٹرین راوی کے پل سے گزر رہی ہے تو ساتھی مسافر کہتا ہے سردار جی مرے ہوئے بچے کو کب تک ساتھ رکھو گے، یہیں سے پھینک دو دریا میں، کلیان ہو جائے گا۔ درشن سنگھ نے پوٹلی سی اٹھائی اور واہگورو کہہ کر دریا میں اچھال دی، اندھیرے میں ہلکی سی آواز سنائی دی — کسی بچے کی! مردہ بچہ تو وہیں تھا ماں کی چھاتی سے لگا ہوا، اور لوگ نعرے لگا رہے تھے ''واگھا آ گیا واگھا آ گیا'' گویا آزادی کی سرحد پار کرتے ہوئے ہم نے زندہ قدروں کو تو پھینک دیا اور نفرت، دہشت اور تعصب و تنگ نظری کی مردہ لاش جس کو تلف کر دینا چاہیے تھا، وہ ابھی تک ہمارے گلے سے لگی ہوئی ہے اور جس کو ہم طربیہ سمجھ رہے ہیں، اصلاً وہ ہمارا المیہ ہے۔

میں اس مختصر مضمون کو مختصر رکھنا چاہتا تھا لیکن گلزار کے ساتھ انصاف کے لیے ہنوز دو ایک مزید کہانیوں کا ذکر ضروری ہے جو دوسری تمام کہانیوں سے ہٹ کر ہیں۔ کہانی 'نجوم' کا تعلق اس طور سے ہے جس کو آج کل Sci Fiction کہا جا رہا ہے۔ اس میں روشنی کی رفتار ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی بنا پر اس بجھے ہوئے سورج کا ذکر ہے جو ہم سے دس ہزار نوری سال دور ہے اور کروڑوں سال جلنے کے بعد بجھ چکا ہے۔ اب بھی کوئی شعلہ بھڑک اٹھتا ہے تو اس کی لپٹیں بیس پچیس ہزار میل کی بلندی تک اٹھتی ہیں اور ان کی روشنی (دس ہزار نوری سال طے کرنے کے بعد) ایک بار ۱۸۴۱ء میں اور دوسری بار ۱۸۵۴ء میں اس زمین پر دیکھی گئی تھی۔ ان سائنسی واقعات و واردات کو مرزا غالب کے ملازم کلو اور منیر کے مکالموں اور اختر شناسی کو اس زمانے کے لوگوں کے اعتقادات سے جوڑ کر بیان کیا گیا ہے۔ کیونکہ ۱۸۴۱ء کے چمکدار نئے ستارے کو مغلوں کی خوش بختی کی بشارت بمعنی دیوان غالب کی اشاعت پر منتج قرار دیا گیا ہے جو واقعتاً مغل کلچر کا سب سے روشن ستارہ ہے اور ۱۸۵۴ء میں چمک دار ستارے کے دوبارہ نمودار ہونے کو استاد ذوق کے انتقال اور غالب کے استاد شہ ہونے اور بالآخر اپنا ادبی مقام پانے کا مظہر سمجھا گیا ہے۔ گلزار نے اس کہانی کو وضع کرتے ہوئے اختر شناسی اور سائنس نیز تاریخ کے جو مراحل طے کیے ہوں گے اور ان تینوں کے

Scanned by CamScanner

تخلیقی میل سے جو کام لیا ہے، اس سے نہایت دلچسپ بیانیہ سامنے آیا ہے۔ 'نجوم' کی طرح 'آگ' اور 'جنگل نامہ' بھی بہت مزے کی کہانیاں ہیں اور لطف کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ بچے بوڑھے چھوٹے بڑے، سب ہی ان کہانیوں سے الگ الگ کیفیت اخذ کر سکتے ہیں۔ ان کہانیوں میں آرکی ٹائپل عنصر تو ہے ہی، ان کو Eco-friendly بھی کہا جا سکتا ہے۔ 'آگ' میں قبل تاریخ کے آدمی باسی تصورات کی فضا ہے اور یہ کہ قدیم ترین انسان نے سب سے پہلے آگ کو کس طرح رام کیا ہوگا اور گھر میں بسایا ہوگا۔ آج کل ماحول شناسی اور ماحول دوستی کی وہ ریل پیل ہے کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ کرۂ ارض انسانی تہذیب و تمدن کے ہاتھوں تقریباً تباہی کے کنارے آلگا ہے اور اس جاندار کے ہاتھوں جس کو 'انسان' کہتے ہیں، پانی، دریا، پہاڑ، پیڑ، پودے، چرند، پرند، کچھ بھی محفوظ نہیں۔ ہوا، بادل، فضا، خلا سب زہر سے بھر رہے ہیں اور 'اوزون' کا پھٹاؤ ایک الگ مسئلہ ہے۔ ایسے میں گلزار کی 'جنگل نامہ' بادِ نسیم کے ایک جھونکے کی مانند ہے جس میں جانور، جنگل، انسان، حیوان، پھر چرند، پرند، پیڑ، پودے سب زندگی کی ایک ہی ڈور سے بندھے نظر آتے ہیں اور اس ڈور کا ایک سرا ہے سالم علی، پرندوں کا عاشق اور ہمزاد جو جتنا انسان تھا اتنا ہی انسان سے ماورا زندگی کے بڑے معنی کا مظہر بھی جس کی پوری اہمیت کو سمجھنا ابھی باقی ہے۔

ایسی گوناگوں کہانیوں کے پیشِ نظر گلزار نے ایک باکمال کہانی کار کہلانے کا حق تو پا ہی لیا ہے۔ اس مختصر مطالعے کی اور جہات بھی ہو سکتی تھیں لیکن فی الحال اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ کچھ کہانیوں کا ذکر رہ بھی گیا مثلاً دھواں، جس کا حسن قاری خود پالے گا۔ بہر حال ان کہانیوں میں زندگی کے جو رنگ ہیں، تجربے کی جو وسعت ہے، واقعے کو کہانی بنانے کا جو ہنر ہے، نفسیات کے جو پیچ و خم ہیں، نیز کچلے دبے پسے لوگوں یا عورت مرد کے جو مسائل ہیں، یا جن و انس، جنگل و کائنات یا ستارے و سیارے جس طرح زندگی سے آگئے ہیں، ان سے گلزار کی کہانی کاری کا کچھ تو اندازہ ہوا ہوگا، اور اس امر کا بھی کہ گلزار نے زندگی کے تجربے کے جس رخ کو بھی لیا ہے، اس کا فنی، تخلیقی اور جمالیاتی برتاؤ اس نوع کا ہے کہ ہر جگہ گلزار نے کوئی نکتہ، کوئی رمز، کوئی انوکھی بات، کوئی بھید ایسا رکھ دیا ہے کہ تجربہ یا واقعہ یا کردار کہانی بن گیا ہے اور یہ معمولی بات نہیں۔ آپ نے ملاحظہ کیا کہ گلزار کہیں یک سُرے نہیں ہوئے۔ ان کے یہاں زندگی کی سرگم ہے اور ہر سُر دوسرے سے الگ ہے۔ کوئی کہانی کسی دوسری کہانی کا ظل یا عکس نہیں۔ گلزار کی کہانیوں میں زندگی کی کتاب ہے۔ اس کتاب کے کچھ ورق یہاں پلٹے گئے ہیں۔ قاری جہاں سے چاہے ان میں داخل ہو سکتا ہے۔ زمین ہری بھری، فضا اجلی ہے اور زندگی کے گھنے پن میں کیف و نشاط کا سامان بھی ہے اور نظر ہو تو معنی خیزی اور نکتہ آفرینی کا بھی۔

Scanned by CamScanner

محمد صلاح الدین پرویز

خوشبو، جل پریاں، عینک اور پانچ ہزار سال

اس دن میں بہت اداس تھا۔ اداسی کی کبھی کبھی کوئی وجہ نہیں ہوتی، بس یوں ہی کبھی کبھی اداسی، بنا کارن دبے پاؤں چپکے سے سینے کے ابد سناٹے میں دھنس جاتی ہے اور ہم اداس ہو جاتے ہیں... وہ بھی کچھ ایسا ہی دن تھا... اچانک میرے موبائل پہ خوشبو کے کئی سرکونڈے... ادھر سے 'وہ' بول رہا تھا، موٹے موٹے شیشوں کی عینک کے پیچھے خمار کے آنسوؤں سے گندمی آنکھوں والا... میری ساری اداسی جیسے ایک پل میں ہوا ہوگئی اور میں خوش ہوگیا... میں اس لیے خوش ہوا کہ وہ خوش تھا... میں نے کہا، میں نے ایسی کون سی بات کی جو آپ اتنے خوش ہیں، میں نے تو بس آپ کے پرنام کو سادر پرنام بھیجا تھا... اس نے کہا، نہیں، آج میں نے 'استعارہ' کے ذریعے دن میں آنکھیں بند کئے ہوئے بھی سمندر دیکھا ہے اور سمندر کے نیچے کھردری چٹانوں کے پیچھے جل پریوں کی زمردی نیلمی پکھراجی آوازیں سنی ہیں، کیا تم یقین کرو گے کہ ان جل پریوں کی آوازوں کے چہروں پر بھی، خمار کے آنسوؤں سے گندمی آنکھوں پر عینکیں لگی ہوئی تھیں، میں چونک پڑا اور چونکنے سے میری آنکھیں کھل گئیں تو احساس ہوا، میری میز پر بہت سارے گھونگھے، کوڑیاں اور سیپیاں پڑی ہوئی ہیں، انہیں گھونگھوں، کوڑیوں اور سیپیوں میں کہیں کہیں سمندری پھول بھی دمک رہے ہیں اور ان سمندری پھولوں میں کہیں کہیں خوشبو کی روشنیوں کی لالٹینیں بھی جھلملا رہی ہیں۔ میں نے اپنے اس احساس کو دیکھنے کی کوشش میں جب رائٹ سائڈ ٹیبل سے اپنی عینک اٹھانے کی کوشش کی تو میری کوشش اوجھل ہوگئی... رائٹ سائڈ ٹیبل سے میری عینک غائب تھی... یار... میں اپنی عینک کہاں تلاش کروں... میں نے ایک پل کا قہقہہ لگایا اور کہا... آپ کی عینک توڑ کے سمندر کی جل پریوں نے بہت سی عینکیں بنالی ہیں... اب آپ کی عینک واپس نہیں ملنے والی... اس نے بھی ایک پل کا قہقہہ لگایا اور کہا، کیا تم جانتے ہو، جل پریوں کی کتنی لمبی لمبی عمریں ہوتی ہیں... سنا ہے ایک ایک جل پری پانچ

Scanned by CamScanner

پانچ ہزار سال تک جیتی ہے... 'پانچ ہزار سال'! میں ایک دم ایک چھناکے سے جیسے اتیت میں پہنچ گیا... مجھے یاد آیا، میں اس آدمی کو تو پانچ ہزار سال سے جانتا ہوں... میں نے اس آدمی کو برندابن میں بھی دیکھا ہے، جب یہ ایک نیم کی چھایا کے پیچھے سے رادھا کے ماتھے پہ سجی نیلی بندیا کے درد کو دیکھ رہا تھا... میں نے اسے متھرا کے جمنا کنارے بھی دیکھا ہے، جب یہ ایک مرمر کے پتھر پر بیٹھا کرشن کی بانسری کے سروں میں اپنے من کو گیلا کر رہا تھا۔ میں نے اسے رام جی کے بن میں بھی دیکھا ہے، جب یہ سیتا کے ناخنوں پر اپنا ماتھا دھر رہا تھا۔ میں نے اسے گوتم بدھ کے مٹھ کے باہر بھی دیکھا ہے، جب یہ اس کا نروان سن رہا تھا۔ میں نے اسے امرؤالقیس کی محبوبہ عنیزہ کے ماتھے پر بھی دیکھا ہے جب اس کے ماتھے پر چاند، پکھراج بن رہا تھا... میں نے، میں نے اسے ہر عہد میں دیکھا ہے، چاہے وہ میرا کا عہد ہو یا جے شنکر پرشاد کی کامائینی کا، ہر جگہ، ہر محفل، ہر عہد میں، یہ نظر آیا ہے مجھے... لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اس کی آنکھیں اس وقت بھی خمار کے آنسوؤں سے گندھی ہوئی تھیں، اس وقت بھی ان آنکھوں کے آگے موٹے موٹے شیشوں کی ایک عینک لگی ہوئی تھی... اس وقت کیا شیشہ گر اور عینک گر موجود تھے؟... ضرور ہوں گے، تبھی تو وہ موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگائے ہوئے تھا... اس آدمی سے میرا، ایک خوشبو کا تعلق ہے، ایک ایسی خوشبو جو ہم کپڑوں پر نہیں لگاتے لیکن وہ سینے سے ہوتے ہوئے ضرور کپڑوں پر اتر آتی ہے اور چاہنے والے اسے سونگھ لیتے ہیں... مجھ میں اور اس میں اگر کوئی فرق ہے تو بس اتنا کہ وہ ہمیشہ چپل پہنتا ہے اور میں نہیں پہنتا ہوں، وہ ہمیشہ سفید کپڑوں میں ملبوس رہتا ہے، میں نہیں رہتا۔ وہ ہمیشہ عینک لگائے رہتا ہے۔ (آنکھیں تو میری اس سے بھی زیادہ کمزور ہیں) لیکن میں عینک نہیں لگاتا... میں ایسا کیوں کرتا ہوں... کیوں... کیوں... اس لیے، اس لیے کہ وہ ایسا کرتا ہے اور یہ اسی کو زیب دیتا ہے۔ میرے اور اس کے درمیان ایک عظیم رشتہ ہے اور وہ رشتہ ہے خوشبو اور پانچ ہزار سال کا... اور اس پانچ ہزار سال پرانے آدمی کا اردو سے وہی تعلق ہے جو سمندر کا موجوں سے ہوتا ہے، جو میر کا غم سے اور غالب کا مے سے تھا... یہ آدمی یوں تو عمر کے حساب سے مجھ سے بہت بڑا ہے، لیکن میرا دوست ہے... نہیں، نہیں، وہ میرا دوست نہیں بلکہ اس کی شاعری میری دوست ہے، اس نے اردو میں جتنی اچھی بچی شاعری کی ہے اور کہانی لکھی ہے، اس کی اسے داد نہیں ملی... اس کی ایک وجہ نام نہاد نقادوں کی گروہ بندی غیر ضروری فہرست سازی اور مدیروں کا تجاہل اور ستم شعاری بھی ہو سکتی ہے... یا اس کی وجہ کہیں وہ دنیا تو نہیں جس میں وہ آج بھی مقیم ہے۔ کاش، وہ میری طرح، میری دنیا میں، میرے گھر، میرے ساتھ، رہنے لگے، کاش، یہ میرا بے ربط مضمون پڑھ کر اردو کے قارئین، اس سے

Scanned by CamScanner

وہ محبت کرنے لگیں جس کا وہ مستحق ہے۔ سچ کہتا ہوں اگر آج کے تین چار سچے شاعروں اور کہانی کاروں کا نام لیا جائے تو اس کا نام ان میں سے ایک ہوگا۔ بس انہیں اس عینک کی ضرورت ہوگی، جو اس کے لگی ہوئی ہے اور وہ اس لیے کہ اس کے پاس ایک اَن دیکھی خوشبو اور پانچ ہزار سال ہیں...
لیکن اس وقت مسئلہ تو اس کی عینک کا ہے جو میرے خیال میں جل پریاں اٹھا کر لے گئی ہیں...

اے جل پریو! کیا تم گلزار کی عینک واپس نہیں کرو گی...؟

ارے میں یہ کیا لکھ گیا، اصل میں یہ جل پریاں ہی تو گلزار کی نظمیں/کہانیاں ہیں۔

گلزار بھائی، آپ نے سچ کہا تھا... ایک ایک جل پری کی عمر پانچ پانچ ہزار سال ہوتی ہے...

How many miles to Babylon
three scores and ten
Can I get there by candle-light
Yes, and back again
If your heels are nimble and light
You can get there by candle-light

Scanned by CamScanner

ہوا یوں کہ...

جب شاعری شروع کی تھی تو قافیہ ملانے میں ایک ہی کرتب نظر آتا تھا۔ ایک ہنر کا احساس ہوتا تھا۔ شعر کہنے پر لوگوں کا ایک ٹھہکہ سا پڑتا تھا جس سے شاعر کی ہستی بڑی اہم لگتی تھی۔

اور یہ سب چٹکیوں میں ہو جاتا تھا۔

مگر افسانہ سنانے میں یہ بات کہاں؟— کہانی سنا بھی چکو تو "اوہو" یا "اچھا اچھا" بہت ہوا تو "آئے ہائے اف!!" سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ دیوانہ وار واہ واہ اور ٹیڑھے میڑھے زاویوں میں اچھل کود کہاں؟— شاعری کچھ اس طرح شروع ہوئی۔

لیکن نثر بھی پڑھتے تھے۔ کبھی کوئی کہانی ڈس جاتی تو کئی دنوں ہائے ہائے کرتے۔ شعر پر دوسرا شعر تو چڑھ جاتا تھا لیکن کہانی مہینوں نہ اترتی۔ تب جی چاہتا خود بھی ایک بار کہانی لکھیں۔

افسانہ لکھنے کے لیے صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔ جو اس عمر میں چاہے مل بھی جائے، اس عمر میں بہت مشکل سے ملتا تھا— کچھ اس طرح افسانہ نگاری شروع کی۔

ہنرمند تو بہرحال کہیں ثابت نہ ہوئے۔ لیکن روزگار کی زندگی میں نثر اس قدر لکھنی اور پڑھنی پڑی کہ شاعری گوشہ نشینی کی وجہ بن گئی۔ جب بھی فلم اسکرپٹ اور مکالموں سے بھاگے تو شعر کی کٹیا میں پناہ لی۔ گانے اتنے کبھی بھی نہیں تھے لکھنے کے لیے۔ اس لیے شاعری دھیمی دھیمی آنچ پر پکتی رہی۔

افسانوں کا یوں ہوا کہ دورے کی طرح پڑتے تھے۔ کبھی لمبے سفر پر نکلے تو کوئی افسانہ اپنی پوری تشکیل کے ساتھ سامنے آ گیا۔ کبھی گاہے بگاہے لکھی ڈائری دہراتے ہوئے صفحوں میں رکھا مل گیا۔

فلم اسکرپٹ لکھتے ہوئے کوئی نیا کردار سوجھا یا مشاہدے میں آیا یا mould ہو گیا تو جی چاہا کہ اس پر افسانہ لکھیں یا اسکرپٹ کرتے ہوئے بڑی انوکھی چویشن پیدا ہو گئی۔ انسانی زندگی کی جھلک روبرو آ گئی، انسانی رشتوں کی کوئی نئی پرت کھل گئی تو اس پر افسانہ لکھ لیا۔ جو فلم میں نہیں سمایا اسے الگ سے جمع کر لیا۔ کچھ افسانے یوں ہوئے کہ پھوڑوں کی طرح نکلے۔ وہ حالات، ماحول اور سوسائٹی کے دیئے ہوئے تھے۔ کبھی نظم کہہ کے خون تھوک لیا اور کبھی افسانہ لکھ کر زخم پر پٹی باندھ لی!

مگر ایک بات ہے، نظم ہو یا افسانہ۔ ان سے علاج نہیں ہوتا۔ وہ آہ بھی ہیں، چیخ بھی، دہائی بھی۔ مگر انسانی درد کا علاج نہیں ہیں۔

گلزار

بوسکیانا
پالی ہل، باندرہ ممبئی۔ ۵۰

Scanned by CamScanner

افسانے

Scanned by CamScanner

بملدا

اسے جوگ اشنان کا دن کہتے ہیں!

الہ آباد میں، تروینی کے سنگم پر، جہاں گنگا، جمنا اور سرسوتی ملتی ہیں، کہا جاتا ہے کہ اس دن، اس سنگم پر کوئی اشنان کرے تو اس کے سارے روگ دور ہو جاتے ہیں، سارے پاپ کٹ جاتے ہیں اور اس شخص کی عمر سو سال کی ہو جاتی ہے!

میں نے بملدا سے پوچھا! ''کیا آپ مانتے ہیں؟''

بملدا مسکرا دیئے: ''وشواس کی بات ہے۔ ایسا شاستروں میں کہا گیا ہے۔''

ایسٹرونومی کے مطابق یہ دن ہر بارہ سال کے بعد آتا ہے، جب سورج کے گرد گھومتے ہوئے نو کے نو سیارے ایک لائن میں آجاتے ہیں اور اس دن سورج طلوع ہوتا ہے تو اس کی پہلی کرن اس سنگم پر پڑتی ہے۔ اس ایک دن کے لیے یہاں کمبھ کا میلا لگتا ہے جس کی تیاری مہینوں پہلے سے شروع ہو جاتی ہے کیونکہ یہاں آنے والے یاتریوں کی گنتی کروڑوں میں پہنچ جاتی ہے۔ الہ آباد سے لے کر پریاگ شہر تک کندھے سے کندھا چھلتا ہے۔ آس پاس کے بیسوں گاؤں میں پاؤں رکھنے کو جگہ نہیں ملتی۔ اسے ''پورن کمبھ'' کا میلہ بھی کہتے ہیں۔ میلہ تو بہت دن رہتا ہے لیکن آخری نو دن خاص گنے جاتے ہیں، جس میں نواں دن 'جوگ اشنان' کا دن ہوتا ہے۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ اس میلے میں ایک ''سٹیم پیڈ'' (Stampede) کا حادثہ ہو گیا تھا جس میں قریب ایک لاکھ لوگ مارے گئے تھے۔ آج تک اس حادثے کی صحیح وجہ معلوم نہیں ہو سکی۔ بہت سی انکوائری کمیٹیوں نے بہت سی وجہیں تلاش کیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ ناگا سادھوؤں کے ہاتھی بگڑ گئے تھے جس سے لوگوں میں بھگدڑ شروع ہو گئی۔ اس بھگدڑ سے ہوم گارڈز اور ملٹری کے بنائے ہوئے لکڑی کے کچے پل گر پڑے۔ لوگ بدحواسی کی حالت میں بھاگے، دوڑے، گرے، کچلے گئے۔ ہزاروں کشتیاں گنگا میں الٹ گئیں، ڈوب گئیں۔ کمبھ میلے کی تواریخ میں اس سے بڑا سانحہ کبھی نہیں گزرا۔

Scanned by CamScanner

سریش بسو نے اس حادثے کے پس منظر میں ایک ناول لکھا تھا: ''امرت کمبھ کی کھوج'' اور بمل رائے جنہیں سب بملدا کہہ کر بلاتے تھے، اس ناول پر فلم بنا رہے تھے۔

میں بملدا کے ساتھ، اسسٹنٹ تھا۔ کبھی کبھی ان کی فلم میں کوئی گانا بھی لکھ لیتا تھا اور پہلی بار ان کے ساتھ اس فلم کی اسکرپٹ لکھ رہا تھا۔ بملدا کو شاید کسی ایک رائٹر کی ضرورت تھی جو کسی بھی وقت ان کی فرصت کے مطابق ان کے ساتھ بیٹھ سکے، ڈسکس کر سکے اور مناظر درج کر سکے۔ دوسری وجہ شاید یہ تھی کہ میں بنگالی اور ہندی دونوں زبانیں جانتا تھا۔ ناول بنگالی میں تھا اور اسکرپٹ ہندی میں لکھی جا رہی تھی۔ اپنے فرصت کے اوقات میں وہ مسلسل اس ناول پر کام کرتے رہتے تھے۔ ناول کے حاشیوں پر اتنے حوالے اور نوٹس درج تھے کہ ان کی کتاب دیکھ کر لگا تھا کہ ناول کی سطروں میں ایک اور ناول لکھا ہوا ہے۔ جگہ جگہ کاغذوں پر لکھے ہوئے نوٹس بھی کتاب کے صفحوں پر پن سے منسلک کیے ہوئے تھے۔ ایک تو ویسے ہی کافی ضخیم ناول تھا اس پر ان ٹھسے ہوئے کاغذوں سے لگتا تھا کہ کتاب کا پیٹ ابھر گیا ہے۔ ناول ایک اور ناول سے حاملہ ہے۔ جلدا کھڑی پڑ رہی تھی۔

ہر کردار کی تفصیل کچھ یوں حفظ تھی بملدا کو کہ لگتا تھا کمبھ ان کی رگوں میں بہہ رہا ہے۔ کسی نے ان کے سسٹم میں انڈیل دیا ہے۔

''یہ ناول آپ نے کب پڑھا؟'' میں نے ایک بار پوچھا تھا۔

''۱۹۵۵ء میں جب پہلی بار قسط وار شائع ہونا شروع ہوا تھا۔''

''کہاں؟''

''کلکتہ کا اخبار تھا'' آنند بازار—'' سریش ان دنوں انہی کے ادارے میں کام کرتا تھا۔''

''آپ جانتے تھے سریش کو؟''

''ہوں—'' بملدا بہت ٹھہر ٹھہر کے بات کرتے تھے اور ان کی ''ہوں'' تو کمال کی تھی۔ ایک 'ہوں' ہزار مطلب! اس بار میں نے سمجھا وہ بات آگے نہیں بڑھانا چاہتے۔ عادتاً بہت کم گو تھے۔ لیکن سگریٹ کے دو ایک کش لینے کے بعد خود ہی بات کو جاری رکھا۔ "Originally" سریش نے ناول اپنے نام سے نہیں چھاپا تھا۔ ایک فرضی نام سے تھا۔ کال کوٹ!''

''کال کوٹ؟'' میں نے دوہرایا۔

''ہوں...'' میں نے کچھ انتظار کیا۔

وہ پھر بولے۔ ''دس پندرہ قسطوں کے بعد ناول میں وقفہ آ گیا تھا۔ میں کچھ بے چین ہو گیا۔ میں نے ''آنند بازار'' کو خط لکھا تو سریش کا جواب آیا تب پتہ چلا کہ...'' اس بار وہ کھانستے

Scanned by CamScanner

کھانستے کرسی سے اٹھے اور سگریٹ پھینکنے بالکنی تک چلے گئے۔

ناول میں پلاٹ نہیں تھا۔ لیکن اس کے کردار بڑے زندہ تھے اور خاص طور پر وہ رائٹر جس کی نظر سے وہ کہانی کہی گئی تھی، اس کی ڈائری کے حصے بار بار بملدا مجھ سے پڑھوایا کرتے تھے۔ ناول کے آغاز میں لوگوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ایک ٹرین "پریاگ" اسٹیشن سے نکل کر الہ آباد کی طرف روانہ ہوتی ہے۔ بس کچھ منٹوں کا سفر باقی ہے۔ لوگ جوش میں آکر بھجن گانا شروع کر دیتے ہیں۔ ٹرین کی چھت پر بیٹھے ہوئے لوگ چھت پیٹ پیٹ کر نعرے لگانے لگتے ہیں۔ ٹرین رینگتے رینگتے الہ آباد کے پلیٹ فارم میں داخل ہوتی ہے اور مسافروں کی بھیڑ اس طرح باہر نکلنے کے لیے بڑھتی ہے جیسے کسی بلیک ہول سے نکل رہی ہو... ایسی بھیڑ میں تپ دق کا ایک مریض جو اپنا روگ چھڑانے، سو سال کی عمر مانگنے، جوگ اشنان کرنے جا رہا تھا لوگوں کے پیروں تلے کچلا گیا۔ مر گیا۔

بملدا کو اعتراض تھا "یہ موت سریش نے بہت جلدی کرادی۔" بڑے احترام سے میں نے رائے دی۔ "دادا! یہ اکیلی موت کہیں ناول کے انجام کی طرف اشارہ کرتی ہے اور توازن بھی دیتی ہے۔"

"ہوں... لیکن فلم کے لیے ذرا سا جلدی ہے! خیر بعد میں دیکھیں گے تم آگے چلو..."

آگے چلتے چلتے اس اسکرپٹ کو تین سال اور لگے۔ یہ ۱۹۶۲ء کی بات تھی۔ اس دوران بملدا نے دو فلمیں اور بنائیں۔ "بندنی" اور "کابلی والا" لیکن "امرت کمبھ" پر کام چلتا رہا۔ چھوٹے چھوٹے کچھ حصے فلمائے بھی جانے لگے۔ خصوصاً آؤٹ ڈورز کے حصے۔ میلے کے وہ حصے جو مصنوعی طور پر تخلیق نہیں کیے جا سکتے تھے، ہم ان کی شوٹنگ دوسرے میلوں میں جا کر کرنے لگے۔ الہ آباد میں سنگم پر ایک اور میلا لگتا ہے۔ ہر سال، ماگھ کا میلہ — ۱۹۶۲ء کی سردیوں میں ہم اسے فلمانے کی تیاریاں کرنے لگے کیونکہ اس کے دو سال بعد ہی پھر "پورن کمبھ" کا میلہ آنے والا تھا۔

ماگھ میلے کی تیاریاں کرتے کرتے ہی بملدا کی طبیعت کچھ ڈانوا ڈول ہونے لگی۔ کچھ روز بخار میں بھی آفس آتے رہے۔ آفس میں بیٹھے بغیر انہیں چین نہیں آتا تھا۔ بملدا کے لیے کہا جاتا تھا کہ وہ فلم سے بیاہے گئے ہیں۔ ان کے تکیوں میں فلم کی ریلیں بھر دو تو بڑے چین سے سوئیں گے۔

پھر کچھ روز دفتر نہیں آئے تو ہمیں تشویش ہوئی۔ میں ان کے گھر پہنچا۔ میرے ساتھ ہمارے کیمرہ مین بھی تھے۔ کمل بوس۔ بملدا باہر برآمدے ہی میں بیٹھے تھے۔ سامنے چائے رکھی تھی اور چیسٹر فیلڈ سگریٹ کا پیکٹ!! ہمیشہ کی طرح سگریٹ انگلیوں میں سلگ رہا تھا۔

ہم نے طبیعت پوچھی تو جواب دیا "میں الہ آباد نہیں جا سکوں گا۔ تم لوگ جاؤ میلے کے شاٹز

Scanned by CamScanner

لے آؤ'' اور اس کے بعد ایک گھنٹے تک ہمیں شاٹ بتاتے رہے۔ شاٹز کے زاویے سمجھاتے رہے۔ ''کبھ'' کی اسکرپٹ تقریباً زبانی یاد تھی انہیں... شاٹز کی تفصیل کے بیچ میں سگریٹ کے کش لیتے تھے، کھانستے تھے اور چائے کے گھونٹ سڑکتے رہتے تھے۔

کملدا نے ایک دو بار بنگالی میں کہا بھی کہ آپ سگریٹ مت پیجئے۔ کم کر دیجئے۔ لیکن ہر بار ''ہوں'' کہہ کر اسکرپٹ کی بات کرنے لگتے۔

الہ آباد جاتے جاتے گھنک بابو سے پتہ چلا بملدا کو کینسر ہو گیا ہے۔

''بملدا جانتے ہیں؟''

''نہیں!''

گلے کی پتہ نہیں کون سی ٹیوب یا پائپ بتائی تھی گھنک بابو نے۔ کملدا نے کہا ''لیکن اس کے لیے تو سگریٹ بہت مضر ہے!''

''ہاں! لیکن بمل مانتا نہیں۔ اسے کیسے سمجھاؤں؟ کہہ دوں کہ تجھے کینسر ہے تو کل مر جائے گا۔ وہ بہت ڈرپوک ہے۔'' سدھیش گھنک ہمارے منیجر بھی تھے اور بملدا کے نیو تھیٹرز کے زمانے کے دوست بھی!

الہ آباد میں شوٹنگ کرتے ہوئے ایک عجیب بے دلی کا احساس ہوا۔ کام ٹھیک ہو رہا تھا۔ لیکن انمنا سا۔ پہلے کی طرح جوش نہیں تھا۔ کملدا بھی چپ تھے اور میں بھی۔ کوئی بات تھی جو ہم کہنا چاہتے تھے لیکن بول نہیں رہے تھے۔ دماغ کے پیچھے بملدا کے کینسر کا خوف چھایا ہوا تھا اور ذہن کی کسی ایک سطح پر یہ بات نقش ہو رہی تھی کہ یہ شوٹنگ بیکار ہے۔ یہ فلم نہیں بن سکے گی۔ بملدا اب زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گے۔ لیکن یہ بات منہ سے کہنا مشکل تھی۔

کملدا نے ایک شام شوٹنگ سے واپس آ کر پوچھا ''یہ فلم کیوں بنا رہے ہیں بملدا؟''

''میں نے تو پوچھا تھا ایک بار!''

''تو...؟ کیا کہا؟''

میں نے میں نے اس سنگ (نشست) کی بات بتائی جب بملدا نے کہا تھا ''وہ جو رائٹر ہے نا، جس کی نظر سے یہ کہانی کہی گئی ہے، جو امرت کی کھوج میں گیا ہے مجھے لگتا تھا کہ وہ میں ہوں۔ وہ جس امرت کی تلاش میں گیا ہے، جس سے آدمی کی عمر سو سال کی ہو جاتی ہے وہ...'' وہ سگریٹ کے دھوئیں میں کھانسے۔ چہرا لال سرخ ہو گیا۔ پھر جب دم واپس آیا تو بولے ''مجھے بھی اس امرت کی تلاش تھی۔''

Scanned by CamScanner

کچھ سمجھتے ہوئے، کچھ نہ سمجھتے ہوئے میں نے پوچھا تھا "کیا سچ مچ سو سال کی عمر چاہتے ہیں آپ؟"

"ہوں..."

اس روز بات وہیں ختم ہوگئی تھی۔ اگلے ایک موقع پر کہنے لگے "سو سال سے مطلب گنتی کے سو سال نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے۔ آدمی امر ہو جاتا ہے اس امرت سے!"

"وہ کون سا امرت ہے...؟" بہت دیر، بہت دور دیکھا بملدا نے! اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے شاید وہ جانتے تھے کہ انہیں کینسر ہے۔ بولے "تہذیب! سنسکرتی! میں اس زمین کی تہذیب کا حصہ بن جانا چاہتا ہوں تاکہ..." کہنا چاہتے تھے "تاکہ زندہ رہوں لافانی ہو جاؤں" پر کہا نہیں۔

بمبئی واپس آئے تو بملدا کی بیماری بڑھ گئی تھی اور وہ انتھک فلم کار ایک اور فلم شروع کرنے کا پروگرام بنا چکا تھا جس کا نام اس وقت "سہارا" سوچا گیا تھا۔

"اور امرت کمبھ؟" میں نے پوچھا۔

"وہ تو بنتی رہے گی۔ ۶۴ء میں بارہ سال پورے ہوں گے۔ 'پورن کمبھ' کا میلا پھر لگے گا۔ اس کے بعد وہ فلم مکمل کریں گے۔"

۶۴ء میں ابھی دیر تھی اور ایسا لگ رہا تھا کہ بملدا کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ "سہارا" شروع ہوئی۔ تین چار روز کی شوٹنگ ہوئی اور ایک دن سیٹ چھوڑ کر گئے بملدا تو پھر کبھی اسٹوڈیو نہیں لوٹے۔ اچانک کینسر کے بڑھنے میں تیزی آگئی اور ان کے سگریٹ چھوٹ گئے۔ وہ جان گئے انہیں کیا بیماری ہے۔ کچھ ہسپتالوں میں ٹیسٹ ہوئے۔ پھر علاج کے لیے لندن لے جائے گئے۔ لیکن بہت جلد ہی مایوس ہو کر واپس آگئے۔

"میں اپنے گھر پہ مرنا چاہتا ہوں۔" انہوں نے کسی سے کہا تھا۔ اس سخت جانی اور جدوجہد میں سال سے کچھ زیادہ وقت نکل گیا۔ دفتر اکثر بند رہنے لگا۔ یونٹ نے ایک فلم شروع بھی کی "دو دونی چار" کے نام سے لیکن بس یونہی۔ اکھڑی اکھڑی سی۔ ایک عجیب سا ماحول تھا۔ سب جانتے تھے کسی دن بھی بملدا کی موت کی خبر آجائے گی۔ یہ خوف بھی تھا اور انتظار بھی! ایک عجیب بے بسی کا احساس تھا۔

ایک روز بملدا نے مجھے بلوایا اور پوچھا "تم امرت کمبھ کی اسکرپٹ پر کام کر رہے ہو یا نہیں؟"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں کیا کہوں؟ ان کی طرف دیکھتا تو رونا آجاتا۔ جسمانی طور پر بملدا چھتا تک جتنے رہ گئے تھے۔ صوفے کے ایک کونے میں کشن جیسے رکھے ہوئے۔ اٹھاؤ تو ہتھیلی میں آجائیں۔

Scanned by CamScanner

ناراض ہو گئے۔ ''تم سے کہا تھا بلرام کی موت بہت جلدی ہے۔ وہ منظر وہاں سے ہٹا کے میلے میں لے آؤ۔ جب نو دن کی پوجا شروع ہوگی، تو پہلے دن اس کی موت ہوتی ہے!''

میں چپ رہا۔ وہ پھر بولے ''کل سے روز شام کو ہم اسکرپٹ پر بیٹھیں گے۔ اس سال 'پورن کمبھ' کا میلا ہے۔ دسمبر میں شروع ہوگا۔''

میں نے کہا ''جی ہاں! ۳۱ر دسمبر سے نو دن کی پوجا شروع ہوگی۔ اشنان جوگ کا دن جنوری ۶۵ء میں ہوگا۔''

''ہوں...'' کہہ کر چپ ہو گئے۔

منظر کی تبدیلی کے بعد میں اگلے روز پھر پہنچا۔ اسکرپٹ اب تک بملدا کو حفظ تھی۔ اپنی کتاب منگوائی۔ جلد اب اکھڑ چکی تھی۔ صفحات پھٹے جا رہے تھے۔ کچھ اور مناظر کا تذکرہ ہوا اور پھر وہی بلرام...

''بلرام کی موت اور بھی آگے لے جاؤ۔ یہ بھی جلدی ہے۔''

میں نے بحث بھی کی تو صرف ان کا دل رکھنے کے لیے۔

''اصل میں رائٹر اور شیاما کے بچھڑنے کے بعد یہ موت کرا دو۔ پوجا کے پانچویں دن! اور جب میلے میں شوٹنگ کریں گے تو یاد رکھنا کہ...''

اسکرپٹ فائنل کرنے کے ساتھ ساتھ بملدا شوٹنگ کی تیاریاں بھی کرتے جاتے تھے۔ گھنک بابو کو بہت سی ہدایات دی جاتی تھیں اور وہ بڑی فرماں برداری سے درج بھی کرتے رہتے تھے۔

دو تین روز کے بعد بلرام کی موت پھر تبدیل ہوئی۔ اسکرپٹ کی ابتدا سے ہٹ کے اب وہ اسکرپٹ کے آخری سیکوئنس تک پہنچ گئی تھی۔ لیکن بملدا کو کسی طرح تسلی نہ ہوئی۔ دو تین مہینوں کے مباحثے میں بلرام کبھی دو دن پہلے گزر جاتا، کبھی چار پانچ دن کی اور سانس مل جاتی اسے۔ لیکن دھیرے دھیرے یہ موت آگے آگے کھسک رہی تھی۔ اچانک ہی ایک روز میں گیا تو بہت خوش ہو کر بولے۔ ''اب صحیح جگہ ملی اس سین کی۔ جوگ اشنان کا دن! صبح پو پھٹتے ہی جب سورج کی پہلی کرن سنگم کے پانی پر پڑتی ہے، تب...'' جوش میں وہ تھوڑا سا کھانسے۔ ان کا سارا جسم کھڑکھڑا گیا۔ ''تب! بلرام کی موت ہوتی ہے! یہ پہلی موت کلائمیکس کے سٹیم پیڈ (Stampede) کو توازن دے گی۔ بلرام جوگ اشنان کے دن مرے گا۔''

میں نے بھی حامی بھری۔ گھنک بابو نے بھی۔ بملدا بہت جوش میں تھے۔ ''سدھیش ایک سگریٹ دو!''

Scanned by CamScanner

''کیوں؟... کیا ہوا؟... اچانک؟''

وہ بنگالی میں بات کر رہے تھے... ''ارے دے نا!''

''نہیں نہیں سگریٹ نہیں ملے گا!''

''کیوں؟... اس سے کیا ہوگا؟''

''کہا نا منع ہے... ڈاکٹر نے منع کیا ہے!''

بملدا کی دھنسی ہوئی آنکھوں میں دفن آنسو نہ باہر نکل سکے نہ اندر گئے۔ وہیں پڑے کانپتے رہے۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ میں بہانہ کر کے اٹھ آیا اور پھر نہیں گیا۔ مجھ سے ان کی حالت اب برداشت نہیں ہوتی تھی۔ میری حالت بھی سب کی سی ہوگئی تھی۔ ایک خوف! ایک انتظار!!

۶۴ء تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ اور بملدا بھی! ان کا بستر سے اٹھنا بیٹھنا بند ہو گیا تھا۔ گھنک بابو آخر تک ان کے ساتھ رہے۔ رات بھر اسی کمرے میں سوتے تھے۔ ایک دراز آرام کرسی میں۔

جس رات گزرے، گھنک بابو نے بتایا۔ ''میں کھانسی کی آواز سن کر اٹھ گیا۔ دیکھا تو بمل اپنے بستر پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ میں نے پوچھا یہ کیا کر رہا ہے؟ تو صاف جواب دیا۔ ''سگریٹ پی رہا ہوں۔'' میں نے اٹھنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ وہیں سے منع کیا تو بولا ''کیا ہوگا؟ جب نہ پینے سے کچھ نہ ہوا تو پینے سے کیا ہوگا؟'' اسے پھر کھانسی آئی۔ میں نے پھر کہا ''بمل بس کر۔ پھینک دے۔ مت پی۔''

''کیوں؟ کوئی پہلا دن ہے؟ میں تو کئی دن سے پی رہا ہوں! آج تیری آنکھ کھل گئی تو دھونس دکھا رہا ہے...؟''

بمل نے آرام سے سگریٹ پی اور سو گیا۔ ہمیشہ کے لیے۔ پھر نہیں اٹھا۔

مجھے صبح صبح خبر ملی تو جیسے اتنے دنوں سے سر پر خوف کی لٹکتی ہوئی تلوار ہٹ گئی اور سانس آتے ہی آنسو نکل پڑے۔ وہ تاریخ تھی ۶۵ء کی آٹھویں جنوری کی اور وہ دن تھا ''جوگ اشنان'' کا دن!!

Scanned by CamScanner

سن سیٹ بولیوارڈ

پوسٹ مارٹم کے وقت بھی وزیٹنگ کارڈ لاش کی مٹھی میں بھینچا ہوا تھا۔ اس روز بھی چارو جی اپنے معمول کے مطابق صبح ساڑھے پانچ بجے اٹھ گئی تھیں۔ لیکن معمول سے تھوڑی سی زیادہ اتساہک تھیں۔ ہمیشہ ہی اچھی طرح تیار ہو کر بال کنگھی، ہلکا سا غازہ، تاکہ جلد پر جھریاں ہوتے ہوئے بھی بڑھاپے کے پھٹے ہوئے مسام نظر نہ آئیں۔ پوشاک تو ہمیشہ انکے مذاق اور سلیقے کا ثبوت دیتی تھی۔

شودت سے ہمیشہ کہا کرتی تھیں "دیکھو آج بھی لوگ ہمیں دیکھتے ہیں تو کنکھیوں سے کھسر پھسر کرتے ہیں۔ اشارے کرتے ہیں کہ چارولتا جا رہی ہیں۔ خود کے لیے نہ سہی اپنے فینز (Fans) کے لیے ہمیں صحیح سلیقے سے رہنا چاہیے۔"

شودت ان کا خانساماں تھا۔

اس روز صبح جب وہ چائے کی ٹرے لے کر ان کے سامنے گیا تو چارو جی آئینے کے سامنے کھڑی خود سے ہی کچھ بات کر رہی تھیں۔ ذرا سی جھینپ گئیں۔ شودت مسکرا دیا۔ اس عمر میں بھی میڈم کی شرمانے کی ادا کمال تھی۔ اس ادا نے جوانی میں لاکھوں پرستاروں کو جاں بحق کیا تھا۔

"شودت! کوئی گوپال داس مشرا آنے والے ہیں ہم سے ملنے! ذرا چائے ناشتے کا انتظام کر لینا۔"

"کون ہیں؟" ذرا تامل سے شودت نے پوچھا۔

"کوئی رائٹر ہیں۔ ہم پر کتاب لکھنا چاہتے ہیں۔ ان کا خط آیا تھا۔"

اس روز چارو جی کی چال میں اتساہ کچھ زیادہ تھا۔ فلم انڈسٹری سے ریٹائر ہونے کے اتنے سال بعد کسی کو تو اس تنہا جان کا خیال آیا۔ شروع شروع میں بہت جرنلسٹ آیا کرتے تھے۔ اس دور دراز کے بنگلے پر۔ مہابلیشور روز روز کون آتا ہے؟ اور چارولتا بھی بہت سال اپنے "کم بیک" پر جیتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ یہ آمد و رفت کم ہو گئی — کچھ عمر رسیدہ کرداروں کے رول بھی پیش ہوئے انہیں۔ لیکن بوڑھوں کے رول چارو جی نے منظور نہ کیے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر ٹھوڑی اونچی کر کے اکثر

Scanned by CamScanner

دیکھا تھا خود کو۔ گردن پر کوئی سلوٹ نہیں تھی! عمر کا کوئی نشان نظر نہ آیا!... خود سے کچھ مکالمے بھی ہوئے۔ عکس نے کبھی نہ بتایا کہ "تمہاری عمر ہوگئی ہے۔" یہ عکس صرف فلموں میں بولتے ہیں۔

ہاں ڈاکٹر ساہنی نے ضرور کہا تھا پہلے ہارٹ — ہارٹ پرابلم کے بعد "دیکھو تمہارا دل اب اتنا سب نہیں سہہ سکتا جتنا بوجھ اس پر ڈالتی ہو۔ کسی دن کھڑے کھڑے فیوز اڑ جائے گا۔"

"سنگھ صاحب ہوتے شاید —"

شودت نے خبر دی مشرا جی آئے ہیں۔

"ایں؟... ہاں... مشرا جی" انتظار کے باوجود چاروتا نام سن کر چونک گئیں۔ "بٹھاؤ — نیچے ہال میں بٹھاؤ — صوفوں کے غلاف اُتار دیے نا؟"

"جی میڈم"

"اور شینڈلیئر؟ روشن کر دیا؟"

شودت اپنے فرائض خوب سمجھتا تھا۔ وہ آج بھی میڈم کی دھاک جما کر رکھتا تھا لوگوں پر۔ کبھی کبھار کسی پرستار کا کوئی خط آجاتا تو وہ بازار میں دس جگہ ذکر کرتا۔

چارو جی نے نیکلس پہنتے پہنتے محسوس کیا۔ ان کی گردن کچھ دبلی ہوگئی ہے۔ گلوبند ہوتا تو یہ کمی چھپ جاتی۔ لیکن اسے بکے دو سال ہوئے۔ تین ہزار کا لیا تھا کسی زمانے میں۔ اب پکا تیس ہزار کا! سنگھ صاحب ہوتے تو کبھی نہ بیچنے دیتے۔ چاروتا جب سیڑھیوں سے اتریں تو بالکل فلم کا کردار لگ رہی تھیں۔ ابھی آواز آئے گی "شارٹ ساؤنڈ — کیمرہ —"

مشرا جی ہال میں لگے کچھ سنگ مرمر کے بتوں کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ ان کے ہاتھ میں پیڈ نما کاپی تھی۔ جس میں شاید کچھ نوٹ بھی کرلیا تھا۔ چارو جی کو دیکھ کر مشرا جی نے بڑے ادب سے نمسکار کیا۔

"تشریف رکھئے۔"

مشرا جی صوفے پر باادب بیٹھ گئے۔ بڑا اثر پڑتا تھا۔ چارو جی کی شخصیت کا۔ بہت دیر تک مشرا جی کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی۔ بھلے سے شودت چائے کی ٹرے لے کر آگیا۔ دو طشتریوں میں کچھ میٹھا کچھ نمکین۔ چارو جی نے چائے بنائی۔

"میرا پتہ کہاں سے ملا؟"

"گوئیل صاحب نے دیا۔ آپ کے مینیجر ہیں نا بمبئی میں!"

"ہوں...! بہت اچھا انسان ہے گوئیل۔ بہت سال میرا کام سنبھالا ہے اس نے۔ اب بھی

Scanned by CamScanner

وہی دیکھ ریکھ کرتا ہے — چائے لیجئے —!"

پھر ایک وقفہ پڑتا ہوا بیچ سے گزر گیا۔ چارو جی خود ہی بولنے لگیں... "میں بہت تنہائی پسند ہوں۔ زیادہ کام کرنا کبھی پسند نہ تھا۔ اس وقت بھی زیادہ فلمیں نہیں کیں جب دن رات پروڈیوسروں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ بس بھاگ کر یہیں آ چھپا کرتی تھی۔"

"میں آپ کا مکان دیکھ سکتا ہوں؟"

"ہاں، کیوں نہیں! تشریف لائیے —"

چارو جی انہیں ساتھ لے کر سنگ مرمر کے بتوں کے پاس رک گئیں۔ "اٹلی سے لائی تھی یہ جوڑی، بڑی مشکل ہوئی تھی اسے صحیح سلامت یہاں لانے میں۔ کئی سال تو میرے بمبئی والے مکان میں رہے۔ آپ نے تو وہ نہ دیکھا ہوگا؟"

"نہیں!" بڑا مختصر سا جواب تھا۔ لیکن مسکراہٹ کافی لمبی تھی۔

برآمدے سے گزرتے ہوئے چارو جی نے بتایا۔ "بڑے شوق سے یہ مکان بنوایا تھا ہم نے۔ سنگھ صاحب سے بڑے جھگڑے ہوا کرتے تھے تب۔ کبھی پتھر کے چناؤ پر، کبھی لکڑی کے انتخاب میں۔ یہ ٹائلیں سنگھ صاحب بنگلور سے لائے تھے۔ مکان کا نام میں نے ایک انگریزی فلم سے رکھا تھا (Sunset Boule Vard) اور یہ... یہ پنجرا... جس میں کبھی کوئی پرندہ نہیں رکھا ہم نے، پتہ نہیں کیوں اٹھا لائے تھے ایک روز وہ..." اور زور زور سے ہنسنے لگیں جیسے کوئی سین کر رہی ہوں۔ ایک بار تو شوبت نے بھی باہر جھانک کر دیکھا۔ اس طرح ہنستے تو کبھی نہیں دیکھا تھا میڈم کو۔ ہاں وہ زمانہ تھا جب نور اور نیلا آ جایا کرتی تھیں۔ ان کی ہم عصر ہیروئنیں!

چارو لتا سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کہہ رہی تھیں... "بس یہی کہتی، مجھ ہی کو قید کر لو اس پنجرے میں... کہتے "تو پھر وہ بھی سنگ مرمر کا بنوانا پڑے گا... سنگ مرمر بہت پسند ہے مجھے۔ اس پر ننگے پیر چلتے ہوئے بہت اچھا لگتا ہے مجھے۔" سنگھ صاحب کو... یہ انہی کا پورٹریٹ ہے!"

وہ قد آدم تصویر تھی سنگھ صاحب کی۔ اوپر کے برآمدے میں لگی دونوں طرف شمعدان۔ شوبت نے شمعیں جلا دی تھیں۔ وہ جانتا تھا میڈم وہاں ضرور جائیں گی۔

چپ چاپ کچھ دیر ایک ٹک وہ سنگھ صاحب کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ پھر آہستہ سے لبریز آنکھیں پونچھیں اور سر جھکا کے مڑ گئیں۔

مشرا جی پیچھے چل رہے تھے اور وہ کہہ رہی تھیں۔ "بڑی چھوٹی تھی ہماری شادی شدہ زندگی۔ صرف تین سال چار مہینے اور اٹھارہ دن!"

Scanned by CamScanner

ایک بار پھر انہوں نے سسکی لی۔

شودت ہال سے ٹرے ہٹا چکا تھا۔

پان کے لیے ایک بار چارو جی نے آواز دی۔ جواب نہ پا کر سمجھ گئیں باہر ہوگا باغ میں۔ یہ خاموشی کا وقفہ اب انہیں اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ مڑ کر مشرا جی سے کہا ''آپ کو کچھ پوچھنا ہے؟''

''اس گھر کا رقبہ کتنا ہوگا؟''

چارو جی نے کچھ منجمد سی آنکھوں سے دیکھا مشرا جی کی طرف... ''رقبہ؟''

''اور بلڈ اَپ ایریا؟''

چارو جی کچھ بجھ سی گئیں۔ ''گوئل کو معلوم ہوگا''

''کوئی بات نہیں۔ میں گوئل صاحب سے معلوم کرلوں گا۔'' مشرا جی کھڑے ہو گئے۔

چارولتا بھی صوفے کے بازوؤں پر پورا زور دے کر کھڑی ہو گئیں۔

''آپ کو گوئل نے کس لیے بھیجا تھا؟''

''یہ مکان دیکھنے کے لیے کہا تھا۔ شاید جلد ہی بیچنا پڑے! دیکھ کے رکھو۔ کوئی گاہک تیار ہو جائے تو...''

''آپ کا نام؟'' چارولتا نے بڑی ترشی سے پوچھا۔

''دھیرج مشرا! پراپرٹی بروکر ہوں۔ پراپرٹی بیچنے خریدنے کی دلالی کرتا ہوں...'' اس نے اپنا کارڈ سامنے کر دیا۔

اچانک ان کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔ ایک بار چلانا چاہا لیکن آواز نہیں نکلی۔ صرف ہاتھ کے جھٹکے سے اسے باہر جانے کا اشارہ کیا۔

بروکر نے صفائی دینے کی کوشش کی ''دیکھئے گوئل صاحب نے آپ سے بات کرنے کے لیے منع کیا تھا۔ کہا تھا کہ شاید آپ کو...''

''گیٹ آؤٹ...'' اس مرتبہ چارولتا چلائیں۔ لیکن آواز میں ایک خرخراہٹ سی آ کے رہ گئی۔

بروکر گھبرا کے فوراً ہی چل دیا۔

کارڈ ہاتھ میں لیے چارولتا اسے باہر جانے تک دیکھتی رہیں۔ مڑ کے سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ہی وہ لڑکھڑائیں۔ دل کا دورہ پڑا اور...

پوسٹ مارٹم کے وقت بھی وہ وزیٹنگ کارڈ لاش کی مٹھی میں بھنچا ہوا تھا...!

Scanned by CamScanner

مائیکل اینجلو

فلورینس سے آئے اینجلو کو پھر پانچ سال ہو چلے تھے۔ وہ اوبنے لگا تھا روم سے!

''روم میں چہرے نہیں ملتے۔ چہروں پہ کردار نہیں ملتے۔ سب ایک ہی سے لگتے ہیں۔'' اس نے پوپ جولیس سے کہا تھا۔

''میرے چہرے پہ تمہیں کیا نظر آتا ہے؟'' جولیس نے پوچھا تھا۔

''ایک جلتی ہوئی موم بتی!''

جولیس ایک وقفے کے بعد مسکرا دیا۔ اینجلو کی کڑوی باتوں کا وہ عادی تھا۔ ''ہاں میں جانتا ہوں تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ ان ہزاروں بے صورت موم بتیوں میں جلتی ہوئی ایک موم بتی، جنہیں لوگ عبادت کے وقت گرجے کے آلٹر پر جلا جاتے ہیں۔''

اینجلو چپ رہا...

''حیرت ہے خدا کی اتنی بڑی دنیا میں ایک چہرہ دوسرے سے نہیں ملتا اور تمہیں اپنی تصویروں کے لیے شکلیں نہیں ملتیں، ماڈل نہیں ملتے اور چار مہینے سے تم یہودہ کے لیے...''

اس کی بات ادھوری رہ گئی اور اینجلو سینٹ پیٹرز سے باہر چلا گیا۔

پوپ جولیس، اینجلو کے مزاج سے واقف تھا۔ یہ پانچواں سال تھا۔ پانچ سال سے اینجلو سینٹ پیٹرز کے سیٹن چیپل کے گنبد اور دیواروں پر پرانے اور نئے عہد نامے کے اہم واقعات منقش کر رہا تھا اور اب آخر میں جولیس، اینجلو کے ساتھ کوئی بدمزگی نہیں پیدا کرنا چاہتا تھا۔ جولیس ثانی کو یاد تھا کہ اینجلو نے چرچ آف ہولی سپرٹ کے لیے لکڑی پر یسوع کا ''کروسیفکس'' تراشا تھا تو اس کا ماڈل وہ نوجوان تھا جس کا ہولی سپرٹ مونسٹری میں اچانک انتقال ہو گیا تھا۔

وہ برمانتے Bramante نہیں تھا جو تخیل سے کردار پیدا کرتا تھا۔ اسی لیے برمانتے کے کرداروں کے خط و خال ہمیشہ ایک ہی طرز کے لگتے تھے۔ بقول میڈیسی وہ ایک ہی خاندان کے لگتے تھے۔ برمانتے کو ہٹا کر اسے پھر اینجلو سے سمجھوتا کرنا پڑا تھا۔

Scanned by CamScanner

پانچ سال پہلے جب مائیکل اینجلو روم واپس لوٹا تھا تو گھنٹوں سینٹ پیٹرز کے گنبد کے نیچے لیٹ کر آپ ہی آپ کچھ بڑبڑایا کرتا تھا۔ کچھ بولتا رہتا تھا۔ جولیس کو اس کی ذہنی حالت پر شک ہوا تھا۔ ایک بار اس نے بہت پاس جا کر سنا تو وہ بائبل کے کچھ وعظ دوہرا رہا تھا۔

''یہ کیا کر رہے ہو اینجلو؟''

''اوں؟'' اس نے چونک کر دیکھا تھا پوپ کی طرف۔ ''آنتوں کی پٹیاں کھول رہا ہوں۔''

جولیس ثانی جانتا تھا وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ان اینٹ گارے کی، چونے سے بنی ہوئی دیواروں میں وہ چہرے ڈھونڈ رہا تھا۔ یسوع کا چہرہ، مریم کا چہرہ، پطرس، یوحنا اور یہوداہ کا چہرہ۔ وہ جن کے باڈماس کے پاؤں تو نظر آتے تھے، لیکن چہرے بائبل کی آنتوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

جبرئیل کی صورت کے کئی خاکے اس نے کاغذوں پر بنائے تھے۔ جولیس نے پوچھا تھا— ''جبرئیل کا خاکہ کیسے بنایا تم نے؟ وہ تو اس خاکی دنیا سے نہیں ہے۔''

''اس کی آواز سنی تھی۔ پرانے عہد نامے میں!''

''تو پھر خدا کی آواز بھی سنی ہوگی تم نے!'' جولیس نے مذاق کیا تھا۔

''اس کی خاموشی سنی تھی!''

جولیس کو یقین ہو گیا تھا، اس نے صحیح مصور کا انتخاب کیا ہے۔ ''سنکی ہے!'' اس نے ''ویٹی کن'' کمیٹی سے کہا تھا۔ ''لیکن سسٹین چیپل کی شناخت صرف وہی کر سکتا ہے۔''

مریم کا ماڈل اینجلو نے اپنی ماں سے چنا تھا اور اس روز چنا تھا جس دن اس نے اپنی ماں کو ایک بانس پر پانی کے دو ڈول لٹکا کر کندھوں پر اٹھاتے دیکھا تھا۔ ایسی ہی کوئی توانا عورت ہوگی جس نے نبی کا بوجھ اپنی کوکھ میں سنبھالا ہوگا۔ آگ جلا کر جب اس کی ماں، اس کے باپ کے نہانے کے لیے پانی گرم کر رہی تھی تو اس نے بہت غور سے اپنی ماں کا تمتماتا ہوا چہرہ دیکھا تھا۔ آگ کی لپٹوں کے پیچھے دہکتا ہوا، سرخ، گرم کندن کی طرح تپا ہوا چہرہ... کاغذ پر اس نے بہت سے اسکیچ بنائے تھے اس چہرے کے۔

اس رات اس نے چولہے کے پاس بیٹھی ماں سے کہا بھی تھا۔ ''تو نے یسوع کو جنم کیوں نہیں دیا؟''

''اس لیے کہ تیرا باپ مل گیا تھا۔ وہ دیکھ شراب پی کے دھت پڑا ہے۔ جا سنبھال اسے!''

اپنے باپ کو دکھانے کے لیے اس نے اسی وقت ایک گتے پر بڑا سا اسکیچ بنا کر اس کے پلنگ پر لٹکا دیا تا کہ وہ دیکھ لے کہ پینے کے بعد وہ کیا لگتا ہے۔ نیچے لکھا تھا:

Scanned by CamScanner

''باپ اگر تو یہ نا ہوتا تو ماں مریم ہوتی!''

لیکن اس کی ماں کو وہ اسکیچ بہت پسند آیا۔ ہمیشہ اپنے پاس رکھا۔ آخر تک اس سے کہتی رہی:

''ایسا ہی ایک بت بنا دے نا باپ کا۔ بہت معصوم لگتا ہے!''

اور وہ ہمیشہ یہی کہہ کے ٹالتا رہا...

''کوئی سنگ مرمر ہی نہیں ملتا جس کا کردار میرے باپ سے میل کھاتا ہو۔''

بہت سال پہلے کی بات ہے۔ ان دنوں وہ بولوگنا میں رہتے تھے۔ گلی کے نکڑ کا پب اس کا مخصوص اڈہ تھا اور وہی اڈہ اس کے باپ کا تھا۔ باپ میخانے کے اندر بیٹھ کر پیتا تھا اور اینجلو بوتل لے کر پب کے باہر آ کر بیٹھ جاتا تھا۔ سامنے بیٹھے خوانچے والے سے بار بار گرم مونگ پھلیاں خرید کے کھاتا رہتا۔ خوانچے والا جتنی بار مونگ پھلی تولتا تھا کچھ دانے خوانچے سے زمین پر گر جاتے تھے اور سامنے کھڑا ایک ننگا بچہ ہر بار اٹھا کر انہیں خوانچے میں واپس رکھتا اور ایک دانہ منہ میں ڈال لیتا تھا اور پھر اگلے گاہک کا انتظار کرتا تھا۔ اسی تماشے کے لیے وہ بار بار مونگ پھلی خریدتا تھا۔ اس بچے کے بہت سے خاکے بنائے تھے اس نے اور کئی سال بعد جب ''میڈونا آف بروجیس'' کا بت بنایا تو ننھے یسوع کے لیے اس بچے کا ماڈل استعمال کیا تھا۔ چھوٹا سا ننگا یسوع!

وہی دن تھے جب پہلی بار مائیکل اینجلو کو پوپ نے سینٹ پیٹرز کے سٹین چیپل میں پرانے اور نئے عہد نامے کی تمثیلیں منقش کرنے کے لیے کہا تھا۔ اینجلو صرف اس لیے ملاقات کو روم پہنچ گیا تھا کہ اٹلی کا ہر مصور اور سنگ تراش اس کام کے لیے اپنی جان دھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھا۔ تواریخ میں لافانی ہو جانے کے لیے یہ ایک کام ہی کافی تھا۔ لیکن مائیکل اینجلو کو لافانی ہو جانا کافی نہیں تھا۔ اس فانی زندگی کے لیے بھی اس کی کچھ شرائط تھیں، اسے سنگ مرمر کے لیے رقم کی ضرورت تھی۔ پوپ جولیس ثانی نے وعدہ تو کیا۔ لیکن رقم نہیں دی۔

''تمہیں پتھر سے کیوں اتنا لگاؤ ہے؟ رنگوں سے کیوں نہیں؟''

''رنگ دوسروں سے مل کے اپنا رنگ چھوڑ دیتے ہیں۔ بدل جاتے ہیں۔ سنگ مرمر ایسا نہیں کرتا۔''

اور اب وہ رنگوں سے بھی اتنا ہی اوب گیا تھا جتنا روم سے!

چار مہینے گزر چکے تھے۔ چیپل کی نقاشی اب آخری حصے تک آ گئی تھی۔ وہ عیسیٰ کا ''لاسٹ سپر'' منقش کرنا چاہتا تھا۔ لیکن ہر بار اس کا تخیل ایک ہی چہرے پر آ کر خالی ہو جاتا تھا۔ یہودہ! عیسیٰ کا تیرہواں شاگرد جس نے سونے کے تیس ٹکڑوں کے لیے اپنے پیر و مرشد کو رومیوں کے حوالے کر دیا۔

Scanned by CamScanner

صلیب پر چڑھوا دیا۔

چولیس ثانی کی بے تابی بھی بڑھنے لگی تھی۔

اینجلو بھی سارا سارا دن کاغذ کالے کرتا رہتا۔ پرانے اسکیچ نکال کر انہیں پھر دیکھتا، ان پر کام کرتا، لیکن کسی چہرے سے تسلی نہ ہوتی۔

اور ایک دن اچانک روم کے ایک چھوٹے سے گندے پب میں اسے یہودہ مل گیا۔ ضرورت سے زیادہ چمکدار آنکھیں، مچلتی، پھرتیلا، بار بار ادھر ادھر تھوکتا تھا۔ عمر سے پہلے ہی پیشانی چوڑی ہو گئی تھی۔ بولتا تھا تو الفاظ اتنی تیزی سے نکلتے تھے جیسے جیب پھٹنے پر سارے سکے ایک ساتھ گر پڑیں۔ ایک دینار کی ریزگاری لینے آیا تھا اینجلو کے پاس اور اس کی بوتل کا حصے دار بن بیٹھا۔ اینجلو جب باہر نکل رہا تھا تو وہ کسی اور سے دینار کی ریزگاری مانگ رہا تھا۔

اینجلو اسے اپنے ساتھ چیپل میں لے آیا سودا طے کرنے اور اسے بتایا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے یہودہ کی شکل میں نقش کرنا چاہتا ہے۔ وہ لافانی ہو جائے گا۔ اسے چادریں اٹھا اٹھا کر ساری دیواریں اور چھت دکھائی۔ وہ حیرت زدہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ پھر اپنی اس خدمت کے لیے ایک اچھی خاصی رقم کا مطالبہ کیا جو اینجلو دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ پھر اس نے کچھ رقم پیشگی چاہی۔ اینجلو نے وہ بھی دے دی۔ وہ کچھ روز باقاعدگی سے آتا رہا چیپل میں۔ اینجلو اسے بینچک کے لیے بلاتا تھا۔ ایک روز اینجلو کے پرانے اسکیچ پھرولتے ہوئے اس نے 'بولوگنا' کے بچے کے بارے میں پوچھا...

''یہ بچہ کون ہے؟''

''بولوگنا میں رہتا تھا۔ بہت سال پہلے کی بات ہے۔ اسے ننھے یسوع کی صورت دی تھی میں نے۔''

''اس کا نام یاد ہے تمہیں؟''

''ہاں۔ مارسولینی۔''

وہ آدمی مسکرایا۔ اس نے اپنی قمیض کی آستین اٹھائی۔ بانہہ پر کھدا ہوا نام دکھایا۔

مارسولینی

''میں وہی یسوع ہوں جسے تم یہودہ نقش کر رہے ہو!''

Scanned by CamScanner

اچانک وہ اس کے پیچھے آکر کھڑا ہو گیا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟''

وہ آئینے کے سامنے بیٹھی آئی برو پنسل سے اپنے منہ پر مونچھ بنا رہی تھی۔ مسکرا کے بولی!

''مونچھیں لگا کے دیکھنا چاہتی ہوں۔ کیسی لگتی ہوں۔ اچھا اگر میں مرد ہوتی تو؟...''

اسی تحمل اور تجزیے کے سر میں سدھیر نے کہا تھا! ''تمہاری مشکل شاید یہی ہے!''... اور جھولا ہمکاتا ہوا چلا گیا تھا۔

''ویری ڈرامیٹک! ہونہہ!!''

بہت جھنجھلا کر اس نے سوچا تھا... ''اچھا ہمیشہ بالکل صحیح جواب ہی دینا کیا ضروری ہوتا ہے؟ یا ہر بات کا تجزیہ کرنا؟ میں نے کسی تجزیے کے تحت تو مونچھیں نہیں بنائی تھیں۔ انسان مذاق کا جواب مذاق سے بھی تو دے سکتا ہے! ایسی کون سی بڑائی ہے کہ آدمی بائبل بنا گھومتا رہے!''

اس روز سدھیر کو ٹھیس پہنچانے کی بڑی تمنا ہوئی تھی۔ بہت دیر تک آئینے کے سامنے بیٹھی رہی... اور جب تک فون کی گھنٹی نے کان سے پکڑ کر نہیں اٹھایا وہ نہیں اٹھی۔ ''ہیلو...؟''

کوئی رونگ نمبر تھا... ''جی میں سوشیلا تو نہیں۔ تھوڑی سی کم ہوں۔ شیلا! چلے گی؟''

سامنے والے نے کوئی گندی سی گالی دے دی۔ اس نے ہنس کے فون رکھا۔ دل کا سارا غبار کافور ہو گیا... پڑوس کا منڈوا اپنا گھیا گھس مانگنے آیا تو اس نے پوچھا۔ ''گھیا گھس کیا ہوتا ہے؟''

''جی گھیا گھسنے والا۔''

''کیا کرے گا؟''

''گھیا گھسنا ہے!''

ایک پل کو جی چاہا وہی گندی سی گالی اس منڈو کے منہ پر چپکا دے۔ منڈو گیا تو چلتے چلتے سارے کپڑے اُتار کے کمرے میں پھینکتی ہوئی ننگ دھڑنگ غسل خانے میں گھس گئی۔

اس روز تھیٹر میں سدھیر سے ڈانٹ پڑی تھی... اسکرپٹ کی فائل میں سے تین صفحے غائب تھے۔ ''کہاں گئے؟''

''پتہ نہیں!''

''پتہ نہیں مطلب؟''

''پتہ نہیں مطلب... پتہ نہیں!''

اچانک گیند کی طرح سدھیر کی آواز اچھلی۔ چھت سے ٹکرائی اور سیدھی اس کے سر پر آ بجی!

''تو کسے پتہ ہونا چاہیے؟ تمہیں یا مجھے؟'' بڑے غصے سے اس نے اپنی اسکرپٹ اس کے ہاتھوں میں ٹھونستے ہوئے کہا تھا... ''یہ گھر نہیں ہے تھیٹر ہے۔ گھر بنا راشن کے چل سکتا ہے، تھیٹر بنا اسکرپٹ

Scanned by CamScanner

آنکھ اور کان ہی نہیں سوچ اور سمجھ کی کھڑکیاں بھی کھلی رکھنی پڑتی ہیں۔"

ماں بہت متاثر ہوئی شاید میرے جملوں سے، جو انو کے تھے۔

گلی میں ایک بہت بڑا جامن کا پیڑ تھا۔ اسی کے نیچے بیٹھا کرتا تھا بھیکو موچی! سارے محلے کی جوتیاں اسی کے پاس آیا کرتی تھیں اور انو کا تو وہ اڈہ تھا۔ کپڑے چاہے کیسے بھی میلے کچیلے ہوں "کھیڑیا" خوب چمکا کر رکھتا تھا انو۔ بھیکو اپنے گھسینا کو چپل کے انگوٹھے میں ٹانکا لگانا سکھا رہا تھا۔ میں نے جب بھیکو کی کہانی اس کو سنائی تو اس کا گلا رندھ گیا۔ "ہمارے دکھ درد اب آپ لوگ ہی تو سمجھو گے بیٹا۔ اب آپ نہیں جانو گے ہماری کہانی تو اور کون جانے گا؟"

انو کا رتبہ اس دن سے میرے لیے اور بڑھ گیا۔ وہ سچ مچ پیدائشی ادیب تھا۔

کالج ختم ہو گیا اور میں دلی چھوڑ کے بمبئی چلا آیا۔ میری نوکری لگ گئی تھی اور انو اپنے بڑے بھائی کی "بیٹھک" پر ان کا ہاتھ بٹانے لگا۔ جہاں سے وہ آیورویدا اور ہومیوپیتھی کی دوائیاں دیا کرتے تھے۔ کسی سرکاری دفتر میں نوکر تھے۔ لیکن صبح و شام دو دو گھنٹے اپنی بیٹھک میں یہ دواخانہ بھی چلاتے تھے۔ انو کے لیے بہت سی نوکریوں کی سفارش کی لیکن حاصل نہ ہوا۔ میں ایک بار بہن کی شادی پر دلی گیا تو ان سے ملاقات ہوئی۔ بہت بیمار تھے۔ مجھ سے کہنے لگے "تم ہی کچھ سمجھاؤ انو کو کچھ کام کاج کرے۔ یہ دنیا بھر کہانیاں لکھنے سے کیا ہوگا؟" — میں چپ رہا۔ وہ دیر تک سینے کا بلغم خالی کرتے رہے۔ پھر خود ہی بولے "وہ حرامزادی اس کا پیچھا چھوڑ دے تو اس کی مت ٹھکانے آجائے۔"

میں نے انو سے پوچھا "وہ حرام زادی کون ہے؟" — بولا "افسانہ نگاری! بس اسی کو گالیاں دیا کرتے ہیں بھائی صاحب۔ وہ سمجھتے ہی نہیں۔ وہ جسمانی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ میں سماجی اور روحانی مریضوں کا علاج کرتا ہوں۔ میں سماج کے رستے ہوئے ناسوروں پر اپنے افسانوں کے پھاہے رکھتا ہوں۔ اندھیرے میں بھٹکتے ہوئے مظلوم انسانوں کے لیے چراغ جلاتا ہوں۔ انہیں اپنی ذہنی غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے ہتھیار فراہم کرتا ہوں..."

میرا جی چاہا تالی بجادوں۔ وہ بہت دیر تک بولتا رہا۔ اس نے بتایا اس کی پہلی کتاب چھپنے کے لیے تیار ہے۔ ملک کے بڑے بڑے ادبی رسالوں میں اس کی کہانیاں چھپ رہی ہیں۔ اکثر تقاضے آتے ہیں رسالوں سے۔ لیکن وہ سب کے لیے لکھ نہیں پاتا۔ وہ ایک ناول بھی لکھ رہا ہے۔ لیکن 'بیٹھک' سے اتنا وقت نہیں ملتا کہ وہ جلدی سے پورا کر سکے۔ بڑے بھائی بہت بیمار رہتے ہیں اور ان کے دو بچے! بے چارے!!... ان بچوں کو لے کر بھی وہ ایک کہانی سوچ رہا تھا!

اس کی بات چیت میں اب بڑے بڑے مصنفوں کا ذکر آتا تھا۔ کچھ نام میں نے سنے ہوئے تھے۔ کچھ وہ بتا دیتا تھا۔ سعادت حسن منٹو، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی کے بعد

Scanned by CamScanner

''کافکا'' اور ''سارتر'' کی وجودیت کی بات کر رہا تھا۔ مجھے لگا شاید کہانی کہیں پیچھے چھوٹ گئی۔ لیکن انل کمار چٹوپادھیائے نے مجھے سمجھایا۔ ''کہانی صرف پلاٹ کے واقعات کی تفصیل اور اس سے پیدا ہونے والے کرداروں کے تعلقات کا ہی نام نہیں ہے بلکہ ذہنی حادثات کے تاثرات بھی اپنے آپ میں ایک کہانی کو جنم دیتے ہیں اور اس کے جمالیاتی تاثرات کو...''

بات میرے اوپر سے گزر رہی تھی لیکن میں اس کے وزن سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

انل ایک بار بمبئی آیا۔ کسی رائٹرز کانفرنس میں حصہ لینے۔ اس کی چاروں دستخط شدہ کتابیں میں نے الماری سے نکال کر دکھائیں... میں اپنے دوستوں کو یہ کتابیں دکھانے میں بڑا فخر محسوس کرتا تھا۔ اتنے بڑے ادیب کی کتابیں! اور اب وہ خود میرے ہاں رہ رہا تھا۔ میں نے بھائی صاحب کے دونوں بچوں والے افسانے کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ لکھا؟''

اس نے ایک افسوس ناک خبر دی۔ ''بھائی صاحب گزر گئے اور رشتے داروں نے مل کر ان کی بیوہ پر چادر ڈال دی۔ مجھے شادی کرنی پڑی۔ میں اب ان دونوں بچوں کا باپ ہوں...''

کچھ روز رہ کر انل واپس چلا گیا۔ اب میں اس کے بارے میں اکثر اخباروں میں پڑھ لیا کرتا تھا۔ جب کوئی نئی کتاب چھپتی وہ مجھے ضرور بھیج دیتا۔ برسوں بعد ایک بار پھر دلی جانا ہوا۔ میں اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے گیا تھا۔ اس سے کہا تھا اپنے رائٹر دوست سے ضرور ملواؤں گا۔

''اسی شام جامن کے پیڑ کے نیچے انو اپنی کھیڑیاں پالش کرا رہا تھا۔ گھسیٹا سے... اس کا اڈا اب بھی وہی تھا۔ بات پھر چل نکلی افسانے کی...

''نئی کہانی کا سب سے بڑا مسئلہ حقیقت کا بدلتا ہوا تصور ہے۔ حقیقت صرف وہ نہیں جو دکھائی دیتی ہے بلکہ اصل حقیقت وہ ہے جو آنکھ سے نظر نہیں آتی۔ کہانی صرف ایک منطقی رشتے کا نام نہیں بلکہ اس کیفیت کا نام ہے جو کردار کے تحت الشعور میں واقع ہو رہی ہے...''

میں منہ کھولے چپ چاپ سن رہا تھا۔

انل کہہ رہا تھا ''پچھلے پچاس برسوں میں بڑی تبدیلی آئی ہے۔ اردو افسانے میں۔ ہماری کہانی نے ان پچاس برسوں میں اتنی ترقی کی ہے کہ ہم اسے آج دنیا کے کسی بھی...''

گھسیٹا نے چمکتی ہوئی ''کھیڑیاں'' آگے کرتے ہوئے کہا... ''کس کی کہانی کی بات کر رہے ہو بھائی صاحب؟ جن کی کہانی لکھتے ہو وہ تو وہیں کے وہیں پڑے ہیں۔ میں اپنے باپ کی جگہ بیٹھا ہوں اور آپ اپنے بھائی صاحب کی ''بیٹھک'' چلا رہے ہیں۔ ترقی کون سی کہانی نے کر لی...؟''

''کھیڑیاں'' دے کر گھسیٹا ایک چپل کے انگوٹھے کا ٹانکا لگانے میں مصروف ہو گیا...!

Scanned by CamScanner

اَدّھا

سب ''اَدّھا'' کہہ کے بلاتے تھے۔ پورا کیا! پونا کیا! بس اَدّھا... قد کا بونا جو تھا۔ پتہ نہیں کس نے نام رکھا تھا۔ ماں باپ ہوتے تو ان سے پوچھتا۔

جب سے ہوش سنبھالا تھا یہی نام سنا تھا اور یہ بھی نہیں کہ کبھی کوئی تکلیف ہوئی ہو۔ دل دکھا ہو۔ کچھ نہیں۔ ہر وقت اپنی مستی میں رہتا تھا۔ خربوزے والے نے کہا:

''اَدّھے، ذرا دکان دیکھو میں کھانا کھا کے آیا'' اور اَدّھا بڑے مزے سے ڈنڈی ہاتھ میں لے کر بیٹھ جاتا اور ہانک لگاتا۔ ''آجا، مصری کے ڈلے ہیں!''

وہ کبھی خربوزے بیچتا، کبھی کھجوریں۔ نانی کو وید جی سے ہاضمے کی دوا لا کر دیتا۔ تیسری منزل والے کیشوانی کی بچی کو اسکول چھوڑ کے آتا اور مادھو مستری کو کبھی مزدور نہ ملتا تو وہ اینٹیں ڈھونے کا کام بھی کر لیتا۔ مگر سب سے زیادہ مزہ آتا۔ اسے بارات کے آگے ناچنے میں۔ بارات چاہے کسی کی بھی ہو، بھولے بھٹکے بھی ادھر سے گزر جاتی تو وہ اپنے اس ایک میل کے علاقے میں آگے آگے چھوٹے چھوٹے ہاتھ جھلاتا، چھوٹی چھوٹی ٹانگوں پر تھرکتا ناچتا چلا جاتا۔ اس روز وہاں سے ورق کوٹنے والے الیاس کی بارات نکلی تو وہ حسب عادت آگے آگے ناچتا ہوا چلنے لگا۔ پنڈت نے ٹوکا بھی۔ ''ابے ادھے! مسلمان کی بارات میں ناچ رہا ہے؟''

ہوا میں ہاتھ جھلاتے ہوئے اَدّھا بولا ''ڈھول تو دونوں ہی کے بجتا ہے اور ایسے ہی بجتا ہے!''

ادھا، بارہ سال کے بچوں میں کھیلتا تو انہی جیسا لگتا۔ جب بچے اسکول چلے جاتے تو وہ سوسائٹی کے بیچ والے باغ میں بوڑھے مالی کے ساتھ مل کر نیم کی سوکھی پتیاں جمع کرتا اور رات کو پروفیسر صاحب کی بیٹھک سے ماچس لا کر اس میں آگ لگا دیتا۔

ایک بار پروفیسر صاحب نے اسے پرانا کوٹ دیا۔ ادھے نے باہر آ کر دیکھا اور اسے مالی چاچا کے حوالے کر دیا۔ ''بوری کی بوری دے دی پہننے کو۔ اس میں تو میرے جیسے تین آ جائیں'' چھترپور سوسائٹی کی پانچ بلڈنگوں میں رہنے والے اسی کنبوں کے لگ بھگ ساڑھے تین سو آدمی تھے اور ادھا

Scanned by CamScanner

ج، خ کے نقطہ کی طرح ان سب میں گھومتا رہتا۔ کسی کا کام اس کے بغیر رکتا نہیں تھا مگر اس کے بغیر چلتا بھی نہیں تھا۔ ادھا نہیں تھا تو جیسے وہ پورے نہیں تھے۔ جیسے بھرے پرے گھر کو پالتو بلی کچھ اور بھر دیتی ہے، ایسے ہی اس نے چھترپور سوسائٹی کو کچھ اور بھر دیا تھا۔

لیکن کل وہ ان سب کو خالی کر گیا، غریب کر گیا۔ کمپاؤنڈ میں جمع بھیڑ کو پروفیسر نے چلا کر کہا تھا ''تم سب ادھورے ہو، ادھے ہو اور جسے تم ادھا کہتے ہو، دیکھو، دیکھو وہ کتنا پورا ہے، کتنا مکمل!''

یہ بات چاہے کل کی ہے مگر اصل بات شروع ہوئی دو سال پہلے۔ اصل بات سے پہلے بھی ایک بات ہوئی تھی اور وہ بھی کچھ کم اصل نہیں تھی۔ مگر اس کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں۔

چھترپور کی سب سے خوبصورت لڑکی رادھا کملانی اس دن ہیر گنج کے علاقے سے آ رہی تھی کہ تین غنڈوں نے اسے گھیر لیا۔ ایک نے آنکھ ماری، دوسرے نے سیٹی بجائی اور تیسرا کندھے کا گھسہ دے کر آگے نکل گیا۔ لڑکی سہم گئی۔ دور گلی کے سرے پر اسے ایک سایا سا نظر آیا اور وہ زور سے چلائی ''ادھے!...''

اس نے آواز سنی تو بھاگا آیا۔ رادھا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ''ادھے ذرا مجھے گھر تک پہنچا دے۔''

ادھے کو بات سمجھتے دیر نہیں لگی۔ شیر ہو گیا۔ رادھا کی بانہہ پکڑ کے بولا ''چلئے... میں ہوں نا۔''

اور وہ ان تین غنڈوں کے بیچ میں سے رادھا کو یوں نکال لے گیا جیسے ہوا کا جھونکا نکل جائے۔ مگر اس رات ادھے کو نیند نہیں آئی۔ پہلی بار اسے لگا کہ اس کی عمر اٹھائیس برس کی ہے۔ اگلے دن سے اس نے اسکول کے بچوں کے ساتھ کھیلنا چھوڑ دیا اور کپڑے استری کروا کے پہننے لگا۔ تبدیلی لوگوں نے بھی دیکھی اور رادھا نے بھی! وہ صرف ہنس دی ''ہاؤ کیوٹ!''

ادھے کو جیسے زندگی میں نیا کام مل گیا۔ باڈی گارڈ کا! محافظ کا! رادھا کو اچھا لگتا۔ وہ صبح اسے کالج چھوڑ کر آتا۔ کبھی کبھی کچھ کتابیں بھی اٹھا لیتا... کبھی شام کو پہنچ جاتا، واپسی میں ساتھ لے کر آتا... لیکن ایک دن رادھا نے ڈانٹ دیا۔ وہ جگدیش سے ملنے جایا کرتی تھی، جہاں ادھا اسے چھوڑ کر آتا تھا— مگر جگدیش کو یہ اچھا نہیں لگا۔ اس نے اعتراض کیا تو رادھا نے ڈانٹ دیا!

''چھی چھی اس پر شک کرتے ہو؟ اس ادھے سے مرد پر!''

بس اس سے آگے ادھے نے نہیں سنا۔ الٹے پاؤں لوٹ آیا۔ آتے ہی گلی میں اس نے لیٹے ہوئے کتے کو پیٹنا شروع کر دیا اور جیسے خود ہی زخمی ہو کر اپنی کھولی میں جا کر لیٹ گیا۔

اگلے دن سے اس کا رویہ بدلا ہوا تھا۔ لوگوں کو بہت حیرت ہوئی۔ جس نے بھی اس سے کوئی

Scanned by CamScanner

کام کہا ادھے نے پوچھا "پیسے دو گے؟"

"پیسے؟... تمہیں پیسے کیا کرنے؟"

"کچھ بھی کروں!..."

دھیرے دھیرے ادھے کے صندوق میں کئی طرح کے نوٹ اور سکّے جمع ہونے لگے۔

یہ اصل بات سے پہلے کی بات ہے... اور اصل بات یہ ہے کہ کچھ مہینے بعد رادھا کی شادی ہوگئی... زور زور سے ریکارڈ بج رہے تھے اور موڑ سے بینڈ بجنے کی آواز آرہی تھی۔ ادھے کو برداشت کرنا مشکل ہوگیا۔ اس کے تھرکنے والے ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ وہ تیزی سے اٹھا۔ صندوق کے سارے پیسے نکالے اور چھترپور سوسائٹی کی "سی" بلڈنگ کے تیرہ نمبر فلیٹ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ تیرہ نمبر فلیٹ میں ستیہ رہتی تھی۔ اکیلی اور بدنام۔ چھترپور کے کئی لوگ چاہتے تھے وہ وہاں سے چلی جائے کیونکہ بیشتر لوگ رات کو وقت بے وقت اس کے فلیٹ سے نکلتے ہوئے یا اندر جاتے ہوئے دیکھے گئے تھے۔ اَدھے نے وہ سب دیکھا تھا۔ سمجھا بھی تھا مگر خاموش رہا اور آج...!

معلوم نہیں فلیٹ کے اندر کیا ہوا، مگر ادھا پورے سات گھنٹے بعد ستیہ کے گھر سے نکلا جب رادھا کی ڈولی جا چکی تھی۔

اس کے بعد ادھا اکثر وہاں جانے لگا۔ لوگوں کو بہت برا لگا کہ ستیہ نے ادھے کے ساتھ بھی سمبندھ بنانے میں گریز نہ کیا اور یہ بات انہیں برداشت نہیں ہوئی کہ جس عورت کے ساتھ ان کے سمبندھ ہوں، اس کے ساتھ اس بونے کے بھی تعلقات ہوں۔ وہ چاہے ویشیا ہی کیوں نہ ہو... بس ستیہ کے خلاف پوری سوسائٹی گرم ہوگئی... ایک دو نوجوانوں نے ادھے کو پیٹ بھی دیا... ادھا تلملا اٹھا... مار کھا کے وہ پھر ستیہ کے یہاں پہنچا۔ وہ بستر پر لیٹی ہوئی تھی۔ شاید کچھ بیمار تھی۔ اَدھے نے سیدھے سپاٹ لفظوں میں کہا۔ "ستیہ میں تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

ستیہ نے اس کی طرف دیکھا اور ہوں کہہ کے دوسری طرف کروٹ بدل لی۔

ادھے نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کیا۔ "کیوں؟ مجھ سے شادی نہیں کرسکتی۔ میں آدمی نہیں ہوں؟ کیا تو بھی مجھے... ادھا سمجھتی ہے؟"

ستیہ نے اس کی طرف آنکھ بھر کے دیکھا اور کہا "مجھے سونے دے ادھے! میری طبیعت ٹھیک نہیں!"

ادھے کے ہاتھ سے ستیہ کی بانہہ چھوٹ گئی۔ "ٹھیک ہے پھر مر! جہنم میں جا۔" یہ کہہ کے وہ گھوما۔ دھڑاک سے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور سیڑھیاں اتر گیا۔

Scanned by CamScanner

اصل بات یہ بھی نہیں ہے کیونکہ اس کے بعد بھی ادھا سال بھر تک چھترپور سوسائٹی میں رہا... اڑتی اڑتی خبریں اسے ستیہ کے بارے میں ملتی تھیں... ''سی'' بلڈنگ سے گزرنا اس نے قصداً کم کردیا تھا... کسی نے اسے بتایا ستیہ کے بچہ ہوا ہے اور یہ بات چھترپور سوسائٹی کے لوگ برداشت نہیں کرسکتے تھے... ستیہ کی جان کے پیچھے پڑ گئے... ''اسے نکالو... فلیٹ چھوڑوا'' پھر بھی ستیہ نے کسی طرح چھ مہینے نکال لیے۔

اور یہ ابھی کل کی بات ہے کہ ادھا اپنے راشن کا تھیلا پیٹھ پر لادے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ''سی'' بلڈنگ کے نیچے بہت ساری بھیڑ جمع ہے۔ اس نے پوچھا بھی نہیں مگر کسی نے بتایا کہ ستیہ نے زہر کھالیا ہے۔ ادھا تیزی کے ساتھ اوپر کی طرف بھاگا۔ وہ بھول گیا کہ اس کی پیٹھ پر راشن کا تھیلا ہے اور وہ اسے چھوڑ بھی سکتا ہے... جانے کیوں لوگ اسے راستہ بھی دیتے رہے اور آخر وہ تیرہ نمبر فلیٹ کے دروازے پر پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا ستیہ کی لاش اب بھی پلنگ پر ہی پڑی تھی اور چھ مہینے کا بچہ لاش سے کھیل رہا تھا۔

سارے کمپاؤنڈ میں پروفیسر کی آواز گونج رہی تھی۔ ''یہ بچہ تم میں سے ہی کسی کا ہے۔ تم سب آتے رہے ہو اس کے پاس! میں جانتا ہوں تم میں اتنی انسانیت تو ہے کہ چندہ کرکے لاش کو جلا دو گے... مگر اس بچے کو... میں پوچھتا ہوں کون قبول کرے گا؟''

سب کے سب بت بنے کھڑے رہے۔

اچانک ادھے کے ہاتھ سے راشن کا تھیلا نیچے پھسل گیا۔ سب اس کی طرف دیکھتے رہ گئے... اس نے دھیرے دھیرے قدموں سے جاکر بچے کو اٹھایا اور بنا کسی طرف دیکھے اسے کندھے سے لگائے بھیڑ میں سے گزرتا ہوا سوسائٹی کے کمپاؤنڈ سے باہر چلا گیا۔

پروفیسر کی آواز ابھی تک گونج رہی تھی۔

''تم سب ادھورے ہو۔ آدھے ہو اور جسے تم ادھا کہتے ہو دیکھو، دیکھو وہ کتنا پورا ہے۔ مکمل ہے...!''

Scanned by CamScanner

ایک چابی

آج صبح سے تیسری بار یہ ہوا تھا کہ پرس سے کچھ نکالتے ہوئے اس کے پچھلے گھر کی چابی ہاتھ میں آ گئی تھی... سدھیر کے گھر کی!

سدھیر کو چھوڑے سال ہونے لگا تھا یا ہو چکا تھا۔ لیکن اب بھی پرس ٹٹولتے ہوئے اگر وہ چابی کبھی اس کے ہاتھ کو چھو جاتی تو اس کا جی چاہتا کہ وہ ٹیکسی کا رخ اسی طرف کر لے۔ کہہ دے ٹیکسی والے سے "ادھر نہیں ادھر لے چلو۔ میں نے بس اسی لمحے شوہر بدل لیا ہے۔"

کچھ اسی طرح شوہر بدلا تھا اس نے۔ بالکل ایسے ہی جاتے جاتے... جیسے کوئی ٹیکسی بدل لے!

ایک سال گزر گیا، لیکن اسے یہ محسوس نہیں ہو پایا کہ وہ سدھیر کو چھوڑ چکی ہے۔ ٹی۔ کے۔ اسے بہت پیار کرتے ہیں۔ بہت زندہ دل انسان ہیں۔ روز کوئی شرارت سوجھتی ہے انہیں! کوئی نہ کوئی نیا سرپرائز دیتے ہیں... اچانک ایک شام نئی کار لے کر چلے آئے۔ "چلو تمہیں ڈرائیونگ سکھا دیں۔ ڈرائیور میں رکھوں گا نہیں اور تم ٹیکسی میں گھومتی رہو یہ مجھے پسند نہیں۔ آج سے گاڑی اپنی اپنی..."

لیکن وہ اب بھی ٹیکسی پر سفر کرتی ہے۔ گاڑی جب بھی چلائی کہیں نہ کہیں ٹھوک دی۔ اس سے نہیں سنبھالی جاتی۔ اس نے شادی سے کچھ دن پہلے ہی تو کہا تھا کہ مجھے سمندر بہت اچھا لگتا ہے۔ بس کوٹھی لے لی سمندر کنارے! گاڑی میں بٹھا کر بولے "سیما چلو تمہیں ایک سرپرائز دیں!"

کوٹھی دکھا کر بولے "یہ تمہارا ویڈنگ گفٹ ہے!"

ٹی۔ کے۔ زمین ٹکنے ہی نہیں دیتے اس کے پاؤں تلے!

اور سدھیر! سدھیر پاؤں تلے کی زمین ملنے ہی نہیں دیتا — ڈسپلن! ڈیڈی کیشن!!

صبح اٹھتے ہی پہلا کام تھا گرم پانی میں نمک ڈال کے غرارے کرو! گلے اور آواز کی صفائی، پہلی ایکسرسائز ہے... وقت پر تھیٹر پہنچو، اپنے مکالمے اپنے ہاتھ سے لکھو، یاد کرو۔ بوریت کی حد تک مشق کراتا تھا۔ اسٹیج کی موومنٹس سانس لینے اور سانس چھوڑنے تک فکس ہو جاتی تھیں۔ ایکٹرز اور ایکٹریسز فرنیچر کے ٹکڑے لگنے لگتے تھے۔ لیکن مجال کیا کہ سدھیر کے سامنے کوئی اف کر جائے۔ میتھڈ

Scanned by CamScanner

ایکٹنگ کا ایک کرہ سمجھا دے گا۔ اس کے باوجود شو کے وقت اس کی بے ساختگی قابل دید ہوتی تھی۔ ناظرین کو بنچوں کے بل کھڑا کر دیتا تھا۔

لیکن وہ بور ہو گئی تھی اس کے تھیٹر سے۔ لگتا تھا کسی ہیڈ ماسٹر سے شادی کر لی ہے... گھر نہیں کوئی کلاس روم ہے۔ ایک روز اس نے یوں ہی کہہ دیا تھا... ''میں بال کٹوا دوں۔ چھوٹے کرا لوں... یہ دیکھو!'' اس نے بال موڑ کے کندھوں کے پاس پکڑ کے بتائے تھے۔

سدھیر نے مسکرا کے بڑے آرام سے کہا تھا... ''تو عدالت جاری ہے'' میں لیلا بینارے کا کیا ہو گا اور ''آدھے ادھورے'' میں ساوتری کا؟''

وہ چڑ گئی تھی... ''ہر وقت اپنے ڈراموں کے کردار ہی دیکھتے ہو مجھ میں! کبھی مجھے بھی دیکھا ہے؟''

سدھیر نے کوئی مذاق کیا لیکن وہ نہیں مانی... ''میں جانتی ہوں اگر تمہیں تھیٹر اور مجھ میں چناؤ کرنا پڑے تو تم تھیٹر کو پہلے چنو گے۔ میری جگہ ہی دوسری ہے اور یہ مجھے بالکل پسند نہیں۔''

سدھیر حسب عادت مسکرا دیا۔ اس کی تھوڑی چھو کر بولا۔ ''سیما جان! یہی سوال اگر میں خود سے کروں نا تو بھی پہلے تھیٹر ہی چنوں گا پہلے تھیٹر... پھر تم... پھر میں!''

وہ کچھ کہہ نہیں پائی پر اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔

سدھیر کے خلوص اور سچائی پر اسے کبھی شک نہیں ہوا تھا لیکن کبھی کبھی اس کی باتوں پر شک ہو جاتا تھا۔ کہیں وہ بھی مکالمہ ہی تو نہیں... اس کا انداز ہی ایسا تھا۔ گھر میں کبھی اتار چڑھاؤ محسوس ہی نہیں ہوا۔ اسٹیج پر ایسے ایسے نشیب و فراز پیدا کرنے والا انسان گھر میں اتنا بور کیوں تھا؟ اتنا بے سواد! تھیٹر... اور تھیٹر... اور بس!

ایک ہی بار سدھیر نے بچے کی تمنا ظاہر کی تھی... اور اس نے بہانہ کر دیا تھا... ''مجھے حاملہ ہونے سے ڈر لگتا ہے!''

''تو میں حاملہ ہو جاتا ہوں...'' اس وقت تو سدھیر نے ہنس کے ٹال دیا تھا۔ لیکن دو ایک روز بعد کی بات ہے۔ شاید اس دن کی جس دن سدھیر نے بال کٹوانے کا ذکر کیا تھا۔ سدھیر اپنے کاغذات جھولے میں ڈالتے ہوئے کہہ رہا تھا ''تمہاری مشکل پتہ ہے کیا ہے؟ تم Belonging سے ڈرتی ہو۔ پاؤں میں سانکل (زنجیر) ڈالنے سے گھبراتی ہو۔ زندگی بھر کے لیے کوئی Commitment کرنا نہیں چاہتیں۔ شفٹ کرنے کی گنجائش ہمیشہ پاس رکھنا چاہتی ہو کہ کسی بھی طرف کروٹ لے سکو۔ جب مجھ سے ملی تھیں تو ایک پینٹنگ کے اسکول میں جایا کرتی تھیں۔ پھر پنڈت گری پرشاد سے گانا سیکھنے جانے لگیں۔ تان پورے کو پڑے پڑے زنگ لگ گیا لیکن...''

Scanned by CamScanner

کس کی کہانی

اتنا بھاری نام ہے انّو کا! تب پتہ چلا جب اسکول کی میگزین میں اس کی کہانی چھپی۔ "انل کمار چٹوپادھیائے! چھٹی جماعت!"

تب ہی سے افسانہ نگار بننے کا شوق تھا اسے۔ کہانیاں خوب سوجھتی تھیں اور مجھے تو ہمیشہ سے یقین رہا ہے کہ شاعر یا ادیب ہونا کسی خدائی دین کی بات ہے، ورنہ ہر کوئی شاعر نہ ہو جاتا! انو میں وہ بات تھی جو بڑے بڑے فنکاروں کو پیدائشی ملتی ہے۔

ہم جب گلی ڈنڈا کھیل رہے ہوتے تب بھی انو سب سے الگ بیٹھا کاپی میں کچھ لکھ رہا ہوتا یا سوچ رہا ہوتا اور یہ جاننے کی بے چینی لگی رہتی کہ انو کے دماغ میں کیا چل رہا ہوگا؟... کیسے وہ خلا میں ایک کردار پیدا کرتا ہے اور اسے سامنے پڑے کاغذ پر اتار لیتا ہے۔ پھر وہ چلنے پھرنے لگتا ہے۔ انو جہاں جی چاہتا ہے اسے وہاں بھیج دیتا ہے۔ جو چاہے اس سے کروا لیتا ہے اور جہاں جہاں سے وہ گزرتا ہے کہانی کا ایک پلاٹ بنتا چلا جاتا ہے۔ واہ! یہ افسانہ نگار بھی کمال ہوتے ہیں۔ جسے چاہیں مار دیں، جسے چاہیں زندگی دے دیں۔ ہے نا— خدائی جیسی بات!

انو ہنسا! یہ کالج کے زمانے کی بات ہے۔ "ایسا نہیں ہے۔ میرے کردار من گھڑت نہیں ہیں اور وہ میرے بس میں بھی نہیں ہیں بلکہ میں ان کے بس میں رہتا ہوں۔"

انو اب بات بھی رائٹرز کی طرح کرتا تھا۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی کہانی جب "پرتاپ"، "ملاپ" یا "جنگ" کے سنڈے ایڈیشن میں چھپتی تو مجھے بڑا فخر محسوس ہوتا۔ میں نے اخبار ماں کو دکھایا۔ "یہ دیکھو... انو کی کہانی۔ انل کمار چٹوپادھیائے اسی کا نام ہے!"

"اچھا سنا تو۔"

میں نے کہانی پڑھ کے سنائی ماں کو۔ ایک غریب موچی کی تھی۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ "ارے یہ تو اپنے ہی محلے کے بھیکو موچی کی کہانی ہے۔ اسکی ماں کے ساتھ ایسا ہی ہوا تھا۔"

یہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ لیکن میں نے فوراً انو کے الفاظ دہرا دیئے۔ "اس کی کہانیاں من گھڑت نہیں ہوتیں ماں۔ وہ کردار پیدا نہیں کرتا بلکہ اپنے ماحول سے کردار چنتا ہے۔ اس کے لیے

Scanned by CamScanner

کے نہیں چلتا..."

جان بوجھ کر وہ تھیٹر کے بعد پکچر دیکھنے چلی گئی تھی۔ اکیلی! پہلے سوچا تھا تھیٹر سے رخسانہ کو لے جائے۔ لیکن وہ بہت لڑکیوں کی طرح Behave کرتی تھی اور بڑی چغلی ہے سدھیر کی! فاروق سے کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اسے سدھیر نے پروڈکشن کے کسی کام سے بھیج دیا تھا۔ اکیلی ہی چلی گئی... آخری شو میں!

لوٹ کر سدھیر سے جاگتے ہوئے نہیں ملنا چاہتی تھی۔ اچھا ہی ہوا جو دونوں کے پاس اپنی اپنی چابی تھی۔ فلیٹ کی! لوٹی تو سامنے میز پر ٹیوب جل رہا تھا۔ غلام علی کی غزل سنائی دے رہی تھی۔ وہ جانتی تھی سدھیر سنتے سنتے سوگیا ہوگا۔ کھانا اٹھا کر فرج میں رکھا، فائل اٹھا کر شیلف میں، ٹیپ ریکارڈ بند کیا اور بتی بجھا کر بالکنی میں جا کر لیٹ گئی ٹھنڈے ٹھنڈے فرش پر!... سمندر دور تھا مگر اس کا شور وہاں تک سنائی دیتا تھا...

کچن کے نل کو ٹپ ٹپ، ٹپ ٹپ کرتے دو مہینے ہو چکے تھے۔ سدھیر بھی کئی بار کہہ چکا تھا، وہ بھی کئی بار کہہ چکی تھی۔ لیکن پلمبر سے کسی نے نہ کہا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ چند بنیادی خوبیاں ہر شوہر کے اندر ہونا ضروری ہیں۔ کیل ٹھونکنا، فیوز لگانا، بلب بدلنا، دوائی کی شیشی کھولنا، کارک اڑانا... جیسے شوہر یہ توقع رکھتا ہے کہ اس کی بیوی کو کھانا پکانا یا بٹن لگانا آتا ہی ہوگا، سیما کو بھی یہ امید تھی کہ سدھیر کسی دن شام کو آکر یہ نل ٹھیک کر دے گا۔

ایک شام اس نے کوشش کی اور کچن میں سیلاب آگیا۔ واشر تھا نہیں۔ سدھیر نے کوشش کی، کسی طرح کپڑے کی پٹی لپیٹ کر کام چلا لے۔ سیما مدد کرنے کو آئی اور بہہ گئی ندی میں، کپڑوں سمیت نہا گئی۔ ہاتھ چھوٹے تو پانی چھت کو چھوتا تھا۔ شور الگ الجھن الگ۔ اسی بارش بوچھاڑ میں پہلی بار سدھیر کا کالج کے زمانے کا دوست ٹی۔ کے۔ گھر آیا تھا... نہایت بے تکلف، خوش زبان، خوش مذاق اور پورا پلمبر! وہ بھی پورا بھیگ گیا، لیکن دو منٹ میں نل ٹھیک کر دیا... سدھیر اسے کھانے پر بلا کر بھول گیا تھا اور سیما اس اچانک آمد پر بوکھلا گئی۔

ٹی۔ کے۔ بہت بے تکلف انسان تھے۔ بولے "سیما گھبراؤ نہیں۔ پنجابیوں کی طرح مکا مار کے پیاز کھلا دو گی تو بھی مزا آئے گا۔"

سدھیر بولا "دونوں ہی منگوانے پڑیں گے۔ گھر میں نہ پنجابی ہے نہ پیاز..."

وہ مسئلہ بھی ٹی۔ کے۔ نے حل کر دیا۔ ٹی۔ کے۔ اچھے خاصے خانساماں بھی تھے۔ گھنٹے بھر میں کچھ پکا کر تیار کر دیا... سیما نے پوچھا تھا "اور کیا کیا آتا ہے آپ کو؟"

بس گانا نہیں آتا۔ بجانا سب کچھ آتا ہے!"

Scanned by CamScanner

سدھیر کے کپڑوں میں ٹی۔ کے۔ سدھیر کا ایک اور ورژن Version لگ رہا تھا۔ ہلکا ہلکا، ہنسی مذاق سے لبریز! اسے یاد نہیں اس سے پہلے بھی کبھی وہ اتنا ہنسی تھی اس گھر میں۔ اس نے سدھیر سے کہا بھی تھا "بڑا ہی بے تکلف دوست ہے تمہارا۔ اس سے پہلے تو کبھی کسی کو تمہارے ساتھ مذاق کرتے نہیں دیکھا۔ تھیٹر میں تو سبھی سبارڈینیٹ کی طرح Behave کرتے ہیں۔"

سدھیر نے کتاب سے سر اٹھا کے دیکھا تو اس نے کہہ دیا... "میں بھی!"... اور کروٹ بدل لی تھی۔ ٹی۔ کے۔ سدھیر کے کپڑے لوٹانے آئے تو گھر آنے کی دعوت دے گئے... سدھیر بہت مصروف تھا اپنی نئی پروڈکشن میں! "آدھے ادھورے" کی تیاری ہو رہی تھی۔ اس نے کہہ دیا تھا "تم چلی جانا۔ میں تھیٹر سے سیدھا وہیں پہنچ جاؤں گا۔"

سدھیر کے پہنچنے سے پہلے وہ ٹی۔ کے، کے ساتھ شیمپین پر "چیئرز" بول چکی تھی۔ ٹی۔ کے نے اس روز بھی بہت ہنسایا تھا اسے! سدھیر جب کافی دیر سے پہنچا تو ٹی۔ کے نے مذاق کیا!... "سدھیر اپنی بیوی کا خیال کیا کر نہیں تو کسی روز بھاگ جائے گی..."

"مجھے ساتھ لے لے تو جہاں مرضی بھاگ جائے!"

دونوں نے مذاق کیا تھا اور دونوں سچ نکلے۔ "آدھے ادھورے" کی ریہرسل ہی میں تھیٹر چھوڑ دیا اس نے... پھر وہی جھگڑا سب کے سامنے... سدھیر ڈرامے کی لائنیں پڑھ رہا تھا:

"اور پھر سامنے آیا جگموہن، اونچے سمبندھ، زبان کی مٹھاس، ٹپ ٹاپ رہنے کی عادت، خرچ کی دریا دلی... اور تم نے سوچا مہندر کی جگہ جگموہن ہوتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ حالانکہ یہ ہے کہ مہندر کی جگہ کوئی اور ہوتا تو تم یہی سمجھتیں کہ تم نے غلط آدمی سے شادی کر لی ہے۔ کیونکہ تمہارے لیے جینے کا مطلب رہا ہے کتنا کچھ ایک ساتھ پا کر، کتنا کچھ ایک ساتھ پا کر، کتنا کچھ ایک ساتھ سمیٹ کر، کتنا کچھ ایک ساتھ اوڑھ کر جینا...!"

آگے اس کے مکالمے تھے۔ سدھیر نے دوبار کیو دے کر اسے دھکیلا تھا۔ "لیکن پتہ نہیں کیوں میرا دھیان ٹی۔ کے پر اٹکا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا سدھیر جگموہن کی نہیں ٹی۔ کے کی بات لے کر مجھے طعنے دے رہا ہے۔" لیکن وہ لائنیں تو اسکرپٹ میں موجود تھیں۔ موہن راکیش کا وہ ڈرامہ وہ پہلے بھی پڑھ چکی تھی۔ ٹی۔ کے کو ملنے سے بھی پہلے!

جیسے جیسے ریہرسلیں بڑھتی گئیں اس کی ٹائمنگ (Timing) اکھڑتی گئی... سدھیر ایک دن سب کے سامنے پھٹ پڑا... اس نے بھی سامنے سے جواب دے دیا۔

"سب کے سامنے مت چیخا کرو مجھ پر۔ میں تمہاری آرٹسٹ ہی نہیں، بیوی بھی ہوں!"

"بیوی ہو گی گھر پر یہاں جیسے سب ہیں ویسی تم ہو۔"

Scanned by CamScanner

''میں نہیں رہ سکتی یہاں سب کی طرح گونگی گائے بن کر۔ سب ایسے دیکھتے ہیں جیسے ڈائریکٹر نہیں کوئی اوتار پیدا ہو گئے ہوں۔''

سدھیر نے اس جملے پر حیرت سے دیکھا تھا اسے۔

اور اس نے فائل پٹخ دی تھی ''مجھے نہیں کرنا ہے ڈرامہ... میں تمہارے تھیٹر سے بور ہو گئی ہوں...''

سدھیر کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ ''گھر میں تھیں تو گھر بور کرتا تھا۔ تھیٹر میں ہو تو تھیٹر بور کرتا ہے تمہیں... تم ہمیشہ وہاں رہنا چاہتی ہو جہاں نہیں ہو۔ جہاں ہو اس سے کبھی مطمئن نہیں ہو... اور تمہیں خود بھی نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو۔ کہاں رہنا چاہتی ہو...''

اور حیرت کی بات یہ ہوئی کہ بجائے اس کے، سدھیر تھیٹر چھوڑ کر باہر چلا گیا...

پھر ہفتوں تک ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ کم سے کم تھیٹر سے متعلق تو بالکل بھی نہیں... پہلے پہل وہ ٹی۔ کے کو فون کر لیتی تھی۔ پھر ٹی۔ کے فون کرنے لگے۔ وہ گھر سے لے بھی جاتے اسے اور گھر چھوڑ بھی جاتے... پتہ نہیں کب اور کیسے وہ دونوں ان ملاقاتوں کو سدھیر سے چھپانے لگے تھے۔ وہ جانتی تھی سدھیر شکی مزاج آدمی نہیں ہے لیکن اگر ٹی۔ کے کی بانہوں میں اسے دیکھ لے گا تو کیا کرے گا؟ اسے ٹی۔ کے کے فلیٹ سے نکلتے دیکھ لے تو کیا پوچھے گا بھی نہیں؟ پوچھتا تو اسے برا لگتا! ''مجھ پر شک کرتے ہو؟'' نہ پوچھتا تو اور برا لگتا ''اتنے بے سروکار ہو مجھ سے؟''

ٹی۔ کے نے کمر سے پکڑ رکھا تھا اسے، جب چابی لگا کر دروازہ دھکیل کر وہ اپنے فلیٹ میں داخل ہوئی۔ سدھیر سامنے ہی کھڑا تھا۔ دونوں ہکا بکا رہ گئے... سدھیر کے چہرے پر وہ کچھ بھی نہ پڑھ سکے... ٹی۔ کے نے بہت نارمل رہنے کی کوشش کی۔ ''کیا کر رہے ہو آج کل؟ کسی ڈرامے میں مصروف ہو؟''

''ایک پرسنل سے ڈرامے میں مبتلا ہو گیا ہوں۔''

''مطلب؟''

''مطلب یہ کہ... بیٹھ جاؤ سیما...''

وہ گھبرا گئی تھی۔ سدھیر نے پھر سے اپنی لائین بولی ''ڈرامہ کسی اور کا ہے، میں خواہ مخواہ بیچ میں آ گیا ہوں۔''

''مطلب یہ کہ... ہمارے ہاں ایک مسٹر مکرجی ہیں!''

''کون مکرجی؟'' اس نے پوچھا۔

Scanned by CamScanner

''ایک ہیں... تمہیں شاید یاد نہیں۔ پتہ نہیں۔ پتہ نہیں کوئی یاد رکھنے جیسی بات ہے ان میں یا نہیں۔ لیکن اکثر وہ اپنی خوبصورت بیوی کی وجہ سے یاد رہ جاتے ہیں لوگوں کو۔ وہ خوبصورت بھی ہے، ٹیلنٹیڈ بھی ہے اور ہوا یہ ہے کہ کوئی ان کے عشق میں پڑ گیا ہے یا سمجھ لیجئے وہ کسی کے عشق میں پڑ گئی ہیں۔''

ٹی۔ کے اور سیما کی اچٹتی سی نظر ملی اور الگ ہو گئی۔ سدھیر جیسے ڈرامہ سمجھا رہا تھا۔

''اور عشق کمبخت ایک ایسی چیز ہے کہ اچھے اچھوں کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لیتا ہے۔ لگتا ہے عشق ہی عشق حاصل زندگی ہے۔ باقی فن، آرٹ، ٹیلنٹ تو سجاوٹ کی چیزیں ہیں۔ ہیں تو ہیں، نہیں ہیں تو کیا؟''

پھر وہی بائبل... تجزیہ... اس نے بات کاٹی... ''تو مکرجی کا کیا پرابلم ہے؟''

''اس کا پرابلم یہ ہے کہ اسے معلوم ہو گیا ہے اور وہ جاننا چاہتا ہے کہ وہ کیا کرے؟ چپ رہے؟ ہونے دے جو ہو رہا ہے؟ یا بیوی کو چھوڑ دے؟ گھر سے نکال دے؟ کیا کرے؟''

آہستہ آہستہ سدھیر کی آواز رندھنے لگی تھی۔ ٹی۔ کے اور سیما دونوں سمجھ رہے تھے کہ سدھیر کیا کہہ رہا تھا۔ ڈرامے کے ایک کردار نے اٹھ کر نکل جانا مناسب سمجھا۔ لیکن سدھیر نے ٹھنڈی مگر کرخت آواز میں بٹھا دیا اسے۔ ''بیٹھ جاؤ۔ ٹی۔ کے، تم بھی کوئی بچے نہیں ہو۔ تم سمجھ رہے ہو جو میں کہہ رہا ہوں۔'' سدھیر نے کہا تھا... ''دیکھو قانونی طور پر کوئی شوہر نہیں ہوتا۔ قانونی طور پر کوئی بیوی نہیں ہوتی۔ ہم خواہ مخواہ ان رشتوں پر قانونی مہریں لگاتے رہتے ہیں۔ ان مہروں سے راشن کارڈ بن سکتے ہیں، رشتے نہیں بنتے!''

سدھیر کی آواز میں اس نے پہلی بار غصہ اور آنسوؤں کی گھلاوٹ دیکھی تھی۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا... ''آج تک کوئی کسی آتے کو روک نہیں سکا اور نہ کسی جاتے کو تھام سکا ہے اور میں اپنے سینے میں یہ کینسر لے کر نہیں گھوم سکتا۔ اگر تم دونوں فلرٹ نہیں کر رہے ہو ایک دوسرے کو دھوکا نہیں دے رہے ہو۔ سچ مچ ایک دوسرے کو چاہتے ہو تو ہاتھ پکڑو اور نکل جاؤ اس گھر سے! دفع ہو جاؤ!''

سدھیر کے آنسو نکل آئے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر اسے پکڑ لے، تھام لے، مگر اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی تھی اور سدھیر نے غصے میں اسے لات ماری تھی۔ فرش پر پڑے ریسیور میں کوئی ہیلو ہیلو مسیا رہا تھا۔ سدھیر باہر کا دروازہ کھول کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آواز گھٹ گئی تھی۔

''میں... میں تم دونوں کا فیصلہ سننا چاہتا ہوں... ابھی... اسی وقت!...''

ٹی۔ کے سے شادی کے فوراً بعد ہی اس نے بال کٹوا دیے تھے۔ دراصل اس نے ''لیلا

Scanned by CamScanner

مینارے" اور "ساوتری" کے بال کاٹے تھے۔ وہ تھیٹر بھول جانا چاہتی تھی لیکن سدھیر کو نہ بھول سکی۔ ٹی۔ کے اسے "کوچین" لے گئے جہاں ان کے فشنگ ٹرولر چلتے تھے۔ آٹھ آٹھ دس دس دن سمندر میں رہنا بالکل ہی نیا تجربہ تھا۔ ٹی۔ کے مذاق کرتے تھے: "سمندر میں رہ کر تم اور نمکین ہوگئی ہو!"

جس دن اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے، پاس بیٹھ گئے تھے۔ چہرہ ہاتھوں میں لے کر کہا تھا... "ان آنسوؤں میں سدھیر کا چہرہ نظر آرہا ہے۔ ہے نا؟"

"ہوں!" اس نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

سیما کوئی لڑائی جھگڑا ہو جائے، کھینچا تانی ہو جائے تو کتنا آسان ہوتا ہے رشتہ توڑنا اور بھول جانا کسی کو۔ لیکن سدھیر نے اس طرح اپنی گرفت کو ڈھیلا کر کے ہمیں ہمیشہ کے لیے باندھ لیا ہے... اس سارے واقعے کا مجرم میں ہوں۔ لیکن یہ جرم تو مجھ سے ہونا ہی تھا۔ تم جہاں بھی ملتیں جب بھی ملتیں میں یہی کرتا!"

ٹی۔ کے کے پیار میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔

کوچین سے واپس آئے تو ایک اور واقعہ ہوا۔ صبح صبح جب آنکھ کھلی تو غرارے کرنے کی آواز کانوں میں پڑی۔ بستر سے اچھل کر وہ غسل خانے میں پہنچ گئی... ٹی۔ کے غرارے کر رہے تھے...

"یہ کیا کر رہے ہو؟"

"غرارے، گلے میں خراش ہوگئی ہے۔"

نمک ملا گرم پانی اس نے بیسن میں انڈیل دیا۔ "کوئی ضرورت نہیں ہے غرارے کرنے کی۔ چلئے میں دوا منگوا دیتی ہوں۔"

فوراً اپنے ڈاکٹر صاحب کو فون کیا۔ ٹی۔ کے کان کے پاس کھڑے کھانستے رہے اور تنگ کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب فوراً نہیں آئے شاید مصروف ہوں گے۔ ٹی۔ کے دفتر چلے گئے۔ شام کے وقت وہ ڈاکٹر صاحب کی ڈسپنسری پر چلی گئی۔ ڈاکٹر صاحب اسے دیکھتے ہی بولے... "میں گیا تھا بھئی۔ دیکھ آیا ہوں سدھیر کو۔ وہی پرانی علت ہے ٹونسلو کی۔"

وہ دھک سے رہ گئی۔ صبح ڈاکٹر صاحب کو یہ بتانا ہی بھول گئی تھی کہ اب وہ اس گھر میں نہیں ہے اور لگتا تھا سدھیر نے بھی ذکر نہیں کیا۔

"میرا تو خیال ہے ٹونسلو کا آپریشن کروا دو۔ میری تو مانتا نہیں۔ کہہ رہا تھا سیما سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ تم تھوڑی ضد کرو گی تو مان جائے گا..."

سدھیر کبھی نہیں مانے گا وہ جانتی تھی۔ وہ اسی طرح سہتا رہے گا، لیکن اپنے ٹونسلو کا کچھ نہیں

Scanned by CamScanner

کرے گا۔ آپریشن تو ہرگز نہیں! اس معاملے میں وہ بہت ڈرپوک ہے۔ اسے یاد ہے ٹونسلز پر ''گلیسرین'' لگوانے پر اس نے کتنا اودھم مچایا تھا۔ اس کے سینے پر بیٹھ کر دونوں بازوؤں کو ٹانگوں میں دبا کر اس نے دھمکی دی تھی... ''سیدھی طرح گلیسرین لگوا لو نہیں تو پوری شیشی حلق میں انڈیل دوں گی!... کھولو... منہ کھولو...!''

ٹیکسی اس کے بنگلے پر آ کر رک گئی۔ ٹیکسی کو پیسے دینے کے لیے اس نے پرس میں ہاتھ ڈالا تو پھر وہی چابی ہاتھ میں آ گئی! دربان نے ٹیکسی کا دروازہ کھولا اور اطلاع دی کہ صاحب کا کوچین سے فون آیا تھا۔ وہ آج نہیں آئیں گے، رات کو پھر فون کریں گے۔''

پیسے گنتے گنتے وہ رک گئی۔ کچھ خیال آیا۔ دربان سے کہا... ''میں تھوڑی دیر میں آتی ہوں'' اور ٹیکسی سدھیر کے گھر کی طرف لوٹالی۔

اچانک بہت سے خوف ذہن میں لوٹ آئے۔ سدھیر کیا سمجھے گا؟ کیسے ملے گا اسے؟ آج ہی اس نے سنا تھا کہ سدھیر کی طبیعت اچھی نہیں۔ اس ایک سال میں یا سال سے زیادہ عرصے میں ایک ہی بار اس نے دیکھا تھا سدھیر کو۔ جب ایک دن مارکیٹ میں وہ ٹیکسی سے اتری تھی اور سدھیر وہی ٹیکسی لینے کے لیے آگے بڑھا تھا۔ اس کے پاس سو روپے کا نوٹ تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ سدھیر نے اسے ڈانٹ کر چپ کرا دیا اور اس سے کہا تھا... ''تم جاؤ میں دے دوں گا'' اور ٹیکسی لے کر چلا گیا تھا۔ اس کے بعد آج پھر ٹیکسی سدھیر کی بلڈنگ کے پاس آ کر رکی۔

وہ لفٹ سے اوپر گئی اور کچھ دیر دروازے کے سامنے چپ چاپ کھڑی رہی۔ ایک بار دروازے سے کان لگا کر سنا بھی۔ لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دی... شاید سدھیر گھر پر نہیں تھا۔

پڑوس کا دروازہ کھلا اور منڈو ''نمستے میم صاحب!'' کہتا ہوا تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

لفٹ ویسے ہی کھڑی تھی۔

بہت ہمت سے کام لے کر اس نے دروازے میں چابی گھمائی، دروازہ کھولا اور اندر جا کر کھڑی ہو گئی۔ سب چیزیں ویسے ہی پڑی تھیں۔ بس کچھ زیادہ بکھری ہوئی۔ وہ زمین پر گرا ہوا کشن اٹھا ہی رہی تھی کہ سدھیر کے کمرے سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی کسی لڑکی کی۔ ''لگا تا لو نا۔ دوا لگا لو نا ٹونسلز میں! دیکھو ٹھیک سے لگوا لو نہیں تو...!''

اس کے بعد سدھیر کے کھانسنے کی آواز... اور لڑکی کے ہنسنے کی!

سیما تیزی سے مڑی اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے لفٹ میں گھس گئی... لفٹ نیچے کو چل دی اور اسے خیال آیا گھر کی چابی وہیں دروازے میں لگی رہ گئی... رہ گئی آخر!... اچھا ہوا اب پرس ٹٹولتے ہوئے کبھی اس کے ہاتھ سے نہیں ٹکرائے گی۔

Scanned by CamScanner

دس پیسے اور دادی

بس ایک دس پیسے کے لیے جھگڑا ہو گیا دادی سے۔ اور چلو گھر سے بھاگ گیا۔

دس پیسے بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟ رام منوہر کی جیب میں کتنی ریزگاری رہتی ہے۔ جب چاہیں جا کے پتنگ خرید سکتے ہیں۔ ایک کٹی اور دوسری کی کٹی بندھ گئی۔ مانجے کی چرخی بس ہمیشہ بھری ہی رہتی ہے... اور سدی کے کتنے سارے پتے رکھے ہیں گھر میں۔ یہ سب یاد آتے ہی پھر غصہ آ گیا اسے۔ دادی ہے ہی ایسی گھنی۔ اسی لیے اتنی جھریاں ہیں اس کی شکل پر۔ رام کی دادی کی شکل پر تو ایک بھی نہیں۔ ایک کے بعد ایک اسے دادی کے سارے نقص یاد آنے لگے۔ کان کتنے ڈھیلے ڈھیلے ہیں جب بھی گالوں پر چوٹتی ہے تو آنکھوں پر لٹک جاتے ہیں اور پلکیں تو ہیں ہی نہیں۔ رات کو سوتی ہے تو آدھی آنکھیں کھلی رہتی ہیں۔ منہ بھی کھلا رہتا ہے — دادی کے کارٹون بناتا، وہ ننگے پاؤں ہی ریلوے اسٹیشن تک آ گیا۔ بلا کسی ارادے کے وہ اسٹیشن میں گھس گیا اور جیسے ہی گاڑی نے سیٹی دی وہ دوڑ کر گاڑی میں چڑھ گیا۔

گاڑی چلنے کے بعد اس نے سوچا کہ چلو گھر سے بھاگ جائیں اور گاڑی میں ہی اس نے فیصلہ کیا کہ زندگی میں خود مختار ہونا بہت ضروری ہے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ ایک ایک پتنگ کے لیے اتنے بوڑھے بوڑھے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑیں۔ اسی لیے تو اس کے بڑے بھائی بھی دادی کو چھوڑ کر بمبئی چلے گئے تھے۔ اب کبھی نہیں آتے — کتنے سال ہوئے۔

گاڑی کے دروازے کے پاس ہی بیٹھے بیٹھے اسے نیند آ گئی۔ بہت دیر بعد جب آنکھ کھلی تو باہر اندھیرا ہو چکا تھا... اور تب اسے پہلی بار احساس ہوا کہ وہ واقعی گھر سے بھاگ آیا ہے۔ دادی پر غصہ تو کچھ کم ہوا تھا۔ لیکن شکایت اور گلہ ابھی تک گلے میں رندھا ہوا تھا...

دس پیسے کون سی ایسی بڑی چیز ہے۔ اب اگر پوجا کی کٹوری سے اٹھا لئے تو چوری تھوڑا ہی ہوئی۔ بھگوان کی آنکھوں کے سامنے لے کر گیا تھا۔ خود ہی تو کہتی ہے دادی کہ اس کے دیوتا "جاگرت" ہیں۔

Scanned by CamScanner

''دن رات جاگتے رہتے ہیں؟ کبھی نہیں سوتے؟''

''نہیں! وہ آنکھ بند کرلیں تب بھی دیکھ سکتے ہیں!''

''ہونہہ! تو دس پیسے کیسے نہیں دیکھے؟ اور دیکھے تو بتایا کیوں نہیں دادی کو؟ وہ تو سمجھتی ہے کہ میں نے چوری کی ہے! دادی کے بھگوان بھی اس جیسے ہیں۔ گھنے! کم سنتے ہیں! کم دیکھتے ہیں۔''

کسی نے دروازے سے ہٹ کر اندر بیٹھنے کے لیے کہا۔ اسٹیشن آرہا تھا شاید! گاڑی آہستہ ہورہی تھی۔ گاڑی کے رکتے رکتے ایک بار تو خیال آیا کہ لوٹ جائے۔ لیکن اسٹیشن پر ٹہلتے ہوئے پولیس والوں کو دیکھ کر اس کا دل دہل گیا۔ وہ بنا ٹکٹ تھا۔ یہ خیال بھی پہلی بار ہوا اسے۔ اس نے سنا تھا بنا ٹکٹ والوں کو پکڑ کر پولیس جیل بھیج دیتی ہے اور وہاں چکی پسواتی ہے!

دروازے کے پاس ٹھنڈ بڑھ گئی تھی۔ وہ اندر کی طرف سیٹوں کے درمیان آکر بیٹھ گیا۔ گاڑی چلی اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر لوٹے تو صندوق، پیٹی، بستر کے اوپر نیچے سے ہوتا ہوا وہ کھڑکی کے بالکل نیچے جا کر فٹ ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے بھوک اور پیاس کا احساس ستانے لگا۔ خودمختاری کے مسئلے ایک ایک کر کے سامنے آنے لگے۔ اسے بھوک بھی ستا رہی تھی اور پیاس بھی۔ اوپر سوئے ہوئے حضرت کی صراحی مسلسل ٹرین کے ہچکولوں سے جھول رہی تھی اور صراحی کے منہ پر اوندھا لگا ہوا گلاس بھی مسلسل کٹ کٹ، کٹ کٹ کیے جارہا تھا...

اس وقت نیلی وردی پر پیتل کا چمکتا بلا لگائے، ٹکٹ چیکر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے ہی اس کا اسسٹنٹ ایک بنا ٹکٹ والے کو گدی سے پکڑے ہوئے داخل ہوا... چلو کی تو جان ہی نکل گئی۔ چلتی ہوئی گاڑی میں یہ آدمی کیسے اندر آگیا۔ اسٹیشن سے چڑھتے ہوئے تو دیکھا نہیں تھا۔ ضرور کہیں چھپ کر بیٹھے رہتے ہوں گے یہ لوگ!

سیٹ کے نیچے گھستا گھستا وہ نیلی وردی کے پیچھے کی طرف جا پہنچا... پھر وہاں سے کھسکتا ہوا ڈبے کے دوسری طرف جا نکلا جہاں اسے ٹائلٹ نظر آگیا۔ بس اسی میں گھس گیا اور کھول کے کموڈ پر بیٹھ گیا۔ پاخانے میں کوئی تھوڑا ہی ٹکٹ پوچھنے آئے گا۔ یہ خیال بھی آیا کہ دوسرے لوگ یہ ترکیب کیوں نہیں استعمال کرتے؟ وہ چیچک کے داغوں والا تو کر ہی سکتا تھا جسے ٹی ٹی کے اسسٹنٹ نے گدی سے پکڑ رکھا تھا... تھوڑی دیر کموڈ پر بیٹھے بیٹھے نیند بھی آنے لگی تھی۔

پھر گاڑی نے پٹری بدلی۔ ایک دھچکا سا لگا۔ رفتار بھی کچھ کم ہونے لگی۔ بڑی احتیاط سے اس نے ٹائلٹ کا دروازہ کھولا۔ باہر جھانکا، کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔ جھانک کر دیکھا تو نیلی وردی کہیں نظر نہیں

Scanned by CamScanner

آئی۔ ضرور کہیں چھپ کر بیٹھا ہوگا ورنہ چلتی گاڑی سے کہاں جاتا؟ گاڑی رکی تو وہ فوراً اتر گیا...
سنسان اسٹیشن، آدھی رات کا وقت۔ کوئی اترا بھی نہیں... گاڑی تھوڑی دیر کھڑی ہانپتی رہی۔ پھر بھک بھک کرتی ہوئی آگے چل دی...

چکو ایک بینچ پر سکڑ کے اپنی ہی ٹانگوں میں منہ دے کر بیٹھ گیا اور فوراً ہی تکیے کی طرح ایک طرف لڑھک گیا۔ ٹھک ٹھک کرتا، لالٹین ہاتھ میں لئے ایک چوکیدار آیا اور کان سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

''اے چل باہر نکل! گھر سے بھاگ کر آیا ہے کیا؟... چل نکل، نہیں تو چوکی والے دھر کے لے جائیں گے۔ چکی پسوائیں گے جیل میں!''

ایک دھمکی میں وہ لڑکھڑا کے کھڑا ہوگیا۔ چوکیدار ٹھک ٹھک کرتا پھر غائب ہوگیا۔ چکو، پلیٹ فارم کے نیچے کی طرف ٹہل گیا جہاں مدھم سی روشنی میں ایک بوریوں کا ڈھیر پڑا نظر آرہا تھا... بوریوں کے پیچھے ہی کوئی بڑھیا دادی کی طرح منہ کھولے سو رہی تھی۔ پھٹا پرانا ایک لحاف اوڑھے کوئی بھکارن ہوگی۔ نیند اور برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اسی بھکارن کے لحاف میں گھس گیا... اسے لگا تھا جیسے دادی کے لحاف میں گھس رہا ہے۔ گاؤں میں اکثر یہ ہوتا تھا۔ میراثن اپنے پاس سلاتی تھی اور وہ رات کو اٹھ کر دادی کے لحاف میں جا گھستا تھا۔ سر، زمین پر لگتے ہی سو گیا۔

صبح جب اٹھا تو ویسے ہی بڑھیا سے لپٹ کے سویا ہوا تھا...

بھکارن کے سرہانے پڑے کٹورے میں ریزگاری پڑی تھی... پھر وہی کٹوری یاد آگئی۔ کل رات کی بھوک پھر عود کر آئی۔ اتنی ساری ریزگاری کیا کرے گی۔ بڑھیا... دادی سے پوچھا تھا تو کہتی تھی...

''مر کے بھی تو ضرورت پڑتی ہے پیسوں کی! ورنہ اس کاٹھی کو جلائے گا کون؟''

جھوٹی! کتنی لکڑیاں پڑی تھیں گھر میں! اس کی نظر پھر کٹورے پر گئی۔ ایک دس پیسے نکال بھی لئے تو کیا ہے؟ یہاں تو بھگوان بھی نہیں! دادی بھی نہیں! مانگ لوں تو شاید خود ہی دے دے۔ ادھر ادھر دیکھا اس نے! کینٹین کے پاس رکھی انگیٹھی کا دھواں کہرے کے اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے اٹھا لئے دس پیسے! بڑھیا کا لحاف ٹھیک کیا اور موتری کی طرف چلا گیا۔ واپس آکر مٹی سے ہاتھ دھوئے... دادی نے سکھایا تھا۔ صابن نہ ہو تو چولھے کی راکھ سے ہاتھ مانجھ لیا کرو...

''اور راکھ بھی نہ ہو تو!''

''تو گملے سے تھوڑی سی مٹی لے لو۔ لیکن موتری سے آکے ہاتھ دھویا کرو...'' ہاتھ دھوئے، یخ ٹھنڈے پانی سے۔ کسی نے کوئلہ مسل کر رکھا تھا، ہودی پر۔ منجن کیا ہوگا۔ اس نے دانت بھی مانجھ

Scanned by CamScanner

لئے۔ منہ ہاتھ بھی دھویا... ہاتھ جھٹک کے سکھائے اور نیکر کی جیب میں ہاتھ ڈال کر پونچھے، تو ٹھنڈے ٹھنڈے دس پیسے کے سکے نے ہاتھ پر کاٹ کھایا...

واپس لوٹا تو بڑھیا کے پاس تین چار آدمی کھڑے تھے۔ ایک اس کے سر کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کہہ رہا تھا...

''اکڑ گئی ہے۔ مرے بھی آٹھ دس گھنٹے تو ہو گئے ہوں گے۔''

''رات نیند ہی میں چل بسی شاید!''

چکو گھبرا کے کھڑا ہو گیا وہیں۔ دینگ روم سے بھی کچھ لوگ اسی طرف آ رہے تھے۔

''اب کیا ہوگا اس کا؟''

''اسٹیشن ماسٹر آئے گا تو کسی کو خبر کرے گا۔''

''کس کو؟''

''میونسپلٹی کو! وہی جلائے گی لے جا کے!''

جو پاس بیٹھا تھا اس نے لحاف کھینچ کے منہ ڈھک دیا...

چکو نے نیکر کی جیب سے دس پیسے نکالے اور بڑھیا کے کٹورے میں پھینک دیے۔

سب نے دیکھا اس کی طرف! اور وہ بھاگ لیا... تیز... بہت تیز... اپنی دادی کے پاس!

Scanned by CamScanner

ڈلیا

پہلے تو اس کے کھسم نے ہی آکر خبر دی۔ ''آج مہاراج نے حویلی میں بلایا تھا۔ چھوٹے مہاراج نے۔ میں تو حیران رہ گیا... اور اب وہ سن کر حیران رہ گئی تھی۔

کھسوا بتا رہا تھا... ''ان کے پیادے کھتیاں میں سے ہی پکڑ لے گئے، دونوں ہاتھ باندھ کر رسی سے۔ مجھے تو کوئی بھول چوک بھی یاد نہ آئی۔ لے جا کے سامنے کھڑا کر دیا۔ یہ بڑی بڑی سرے والی آنکھوں سے دیکھا میری طرف!'' کھسوا نے آنکھیں بڑی بڑی کر کے کہا تو ڈلیا کو لگا۔ آنکھیں تو اس کے کھسم کی بھی کافی بڑی تھیں۔ بس دھوپ اور غریبی نے چھوٹی کر دیں ورنہ...!

اور کھسوا کہے جا رہا تھا... ''میں تو سہم گیا۔ پھر ان دونوں پیادوں کو باہر جانے کا حکم دیا... اور کہا کہ جاتے جاتے دروازہ بھیڑ جائیں... میں تو اور بھی حیران ہو گیا پھر زوردار آواز میں پوچھا... ڈلیا تیری جورو ہے کیا؟''

ڈلیا چونک گئی... ''پھر؟''

''مجھ سے پوچھنے لگے... روز کتنے کی شراب پیتا ہے؟ گھر کتنے پیسے دیتا ہے؟ ڈھائی روپے کی مجوری کرتا ہے روز کی اور دو روپے کی شراب پی جاتا ہے۔ صرف آٹھ آنے دیتا ہے جورو کو؟... میں تو پاؤں پڑ گیا... نہیں مالک الٹا بول دیا کسی نے۔ آٹھ آنے کی شراب پیتا ہوں اور دو روپے دیتا ہوں گھر میں۔ بولے... ہم کو سب خبر ہے...''

ڈلیا سمجھ گئی تھی کیا ہوا ہے۔ پرلے والے دن ہی تو مہاراج ملے تھے مارو تھل میں۔ بتے پار والے کنوئیں سے پانی بھر کے لا رہی تھی۔ جب ان کی سانڈنی اس کے پاس پاس آ کر چلنے لگی تھی۔ سر پر دو دو مٹکیاں تھیں۔ وہ اوپر بھی نہ دیکھ سکی۔ لگا کوئی آکاش سے بول رہا ہے...

''اے چھوری پانی پلا گی؟'' (پلائے گی)

وہ رک گئی تھی۔ بغل کی مٹکی سنبھال ہی رہی تھی کہ مہاراج نے سانڈنی کو بٹھا کر ریت پر بٹھا دیا۔

Scanned by CamScanner

"پانی پلا گئی؟... ہماری چھاگل راستے میں خالی ہوگئی۔" مہاراج کی بڑی بڑی سی سرے والی آنکھوں نے تو اس کی چولی ہی پکڑ لی۔ دونوں ہاتھ بھرے ہوئے تھے، پلو بھی نہ کھینچ سکی۔

"کیا ہوا؟ ڈر کیوں رہی ہے تو؟ کھمورے کی ہے نا؟ ہم مہاراج ہیں۔ وہاں کے چھوٹے مہاراج..."

وہ کچھ نہیں بولی، مہاراج اونٹنی سے اترے بھی نہیں۔ پر دیکھتے ہی رہے اس کو۔ ڈرتے ڈرتے وہ بولی تھی... "ہم چھوٹی ذات کے ہیں حکم! دھرم نشٹ ہو جائے گا۔"

"کس کا؟... تیرا یا میرا؟"

"آپ کا، حکم!"

کچھ نہ بولے مہاراج ہنس دیے۔ "پھر ٹھیک ہے مت پلا گھر میں جا کر پی لیں گے..." اونٹنی کو کھڑا کیا اور سر کے اوپر سے ہو کر چلے گئے۔

کھسوا کہہ رہا تھا... مہاراج بولے "رانی جی کو ایک نوکرانی کی ضرورت ہے گھر میں۔ نہلائی دھلائی کے لیے نیتی تائی تیری جورو کا نام لے رہی تھی۔ کل سے بھیج دیجوا سے۔ کپڑا لتا اناج سب مل جائے گا حویلی سے۔"

ڈلیا کانپ گئی۔ اتنے میں سب پتہ لگوا لیا مہاراج نے؟ اس کی گوری چمڑی ہی بار بار اس کی بیری ہو جاتی ہے۔ ماں نے کہا بھی تھا "مٹی مل کے جایا کر منہ پر، نہیں تو کسی روز کا لک پوت کر لوٹے گی..." اور اب کھسم کہہ رہا تھا... "کل سے تو حویلی پر جائے گی کام کرنے..."

پاؤں پٹخ کر کھڑی ہو گئی ڈلیا— "میں کو نہ جاؤں حویلی۔ جانتا بھی ہے جو عورتاں ایک بار حویلی میں چلی جائیں وہاں سے نکل کر کہاں جاتی ہیں؟ سیدھی چکلے پر جا کے بیٹھتی ہیں۔ گھر کو نہ رکھے انہیں!"

کھسوا ٹھکار مار کر ہنس پڑا۔ شراب کا بھبکا لگا ڈلیا کے منہ پر... "تجھے کون خریدے کا چکلے میں! صورت بھی دیکھی ہے سیسے میں؟"

اگلے دن اسے حویلی کے دروازے پر نیتی تائی کے پاس چھوڑ کر کھسوا چلا گیا کھیتوں میں کام کرنے... نیتی سمجھاتی بجھاتی اندر لے گئی مہارانی کے پاس۔ کتنی ڈیوڑھیاں کمرے لانگھ کے وہاں پہنچی۔ مہارانی مالش کروا رہی تھیں۔ زیور گہنے نکال کے سامنے رکھے تھے دری پر، ڈھیر کا ڈھیر... اچھی تھی بیچاری مہارانی۔ بات بات پر ہنستی رہتی تھی۔ دروازے پیچھے سے بولی "کون ہے تائی؟"

"ڈلیا ہے۔ آپ نے بلایا تھا۔"

Scanned by CamScanner

''کس لیے؟''

''وہی نہلائی دھلائی کے کام کو۔''

''اچھا اچھا— صاف ستھری تو ہے؟''

تائی نے اوپر سے نیچے تک دیکھا ڈلیا کو اور بولی... ''دھولیں گے۔ صاف ہو جائے گی۔ اچھی نکلے گی۔''

مہارانی کو ہنسی کی آواز آئی... جیسے کسی نے جھنجھنا ہلا دیا...

وہ جو ڈر تھا ڈلیا کو، ویسا تو کچھ نہیں ہوا حویلی پر بھی بھلے چنگے لوگ لگتے تھے۔ حیرت ہوتی تھی حویلی پر کمروں کے اندر کمرے کھلتے ہی جاتے تھے۔ کتنا گہرا پیٹ تھا حویلی کا۔ آدمی کا آدمی نگل جائے اور ڈکار بھی نہ لے... بڑے مہاراج تو بس چوبارے والے کمرے میں افیم کھا کے پڑے رہتے تھے اور دیکھ بھال کے لیے چھوٹے مہاراج تھے۔ زنانے میں کم ہی آتے تھے۔ پر کبھی کبھی دکھ جاتے تھے رانی جی کے کمرے میں۔ رانی جی نہاتے وقت بڑی باتیں کرتی تھیں۔ بات بات پر میکے کی سنانے لگتی تھیں۔ ''ہمیں تو باپو نے پکی ٹائلوں سے اسٹاپو بنوا دیا تھا آنگن میں۔ روز روز کھرپے سے لائنیں کھینچتے تھے تو فرش خراب ہوتا تھا۔ ایک روز باپو نے راج مستری کو بلا کے... ٹائلیں سمجھتی ہے نا؟ سمینٹ سے بنی اینٹیں ہوتی ہیں۔ رنگ برنگی ان سے اسٹاپو بنوا دیا آنگن میں!'' پھر بولیں... ''تو کیا کھیلتی تھی میکے میں؟''

''ہم کہاں کھیلے ملکن۔ کھیلنے کے وکھت پانی بھرا کرتے اور کھانے کے وکھت کھیتیاں میں کام کیا کرتے تھے۔ مائی ہمارے حصیاں میں ایک پیاز اور باجری کی روٹی ڈال دیتی تھی اور چاٹنے کو نمک کی ڈلی دے دیتی تھی۔ کہا کرے تھے کھانے سے پہلے پانی پی لیجو اور کھانے کے بعد بھی۔ پیٹ جلدی بھر جائے گا...''

''تو تو بڑی غریبی کی باتیں کرتی ہے۔ میں تو کھیلنے کا پوچھ رہی تھی... چل پانی ڈال اوپر...''

پہلی بار جب اس نے رانی کے نہائے پانی سے نہا لینے کے لیے پوچھا تھا۔ تائی سے تو وہ ہنس پڑی تھی۔ بولی... ''تازہ پانی سے نہا لے گی پگلی۔ کنواں ہے گھر میں۔ کنویں بھی کبھی خالی ہوتے ہیں...''

جس روز صابن کی گھسی ہوئی چپچی کر لائی تھی مانگ کے، بار بار منہ کھسوا کے پاس لے جاتی تھی۔ لیکن اس کی ناک سے داروکی باس اترے تو صابن سونگھے نا اور ایک روز نہلا رہی تھی رانی جی کو جب پیار سے مہاراج کی آواز آئی... رانی جی بولیں ''جا۔ جا کے کام پوچھ لے۔ بول دے ہم نہا

Scanned by CamScanner

رہے ہیں۔"

ڈلیا مہاراج کے سامنے جا کر کھڑی ہوگئی۔ "رانی جی نہا رہی ہیں حکم — پوچھا ہے..."

وہ بیچ ہی میں بول پڑے "منہ اوپر ہماری طرف دیکھ کے بات کیا کر"

اوپر دیکھا تو وہی سرے والی بڑی بڑی آنکھوں نے کاٹ لیا۔

"رانی جی سے کہنا ہم نیچے دیوان خانے میں جا رہے ہیں۔ ہمارا ناشتہ پانی وہیں بھجوا دیں..."

پہلی بار اتنی دیر مہاراج کے سامنے کھڑا رہنا پڑا۔

وہ جھولنے میں بیٹھے ناشتہ کرتے رہے اور ڈلیا لسی کا گلاس پکڑے ایک طرف کھڑی رہی۔

ناشتہ کر چکے تو بولے... "اچھا یہ بتا ڈلیا، پانی پلاتے تیرا دھرم خراب ہوتا تھا۔ آج ناشتہ کراتے تیرا دھرم خراب نہیں ہوا؟ اوپر سے لسی کا گلاس لیے کھڑی ہے۔"

"یہ تو آپ ہی کا ان ہے۔ اس میں ہمارا کا ہے حکم؟"

"تجھے کہا ہے اوپر دیکھ کے بات کر۔"

مگر بہت زور لگانے پر بھی نظر اٹھا نہیں سکی۔ آنکھیں اتنی بھاری بھی ہوتی ہیں اسے پتہ نہیں تھا۔ نظر اٹھی اور بوجھل بلی کی طرح گر بھی پڑی...

"پھر؟..."

"ہم ایسے کیسے دیکھیں آپ کی طرف حکم؟"

لسی کا گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے مہاراج نے اسی گلاس سے اس کی تھوڑی اونچی کر دی۔ ایسے ایسے دیکھ کے بات کیا کر۔ اس شرابی کی طرف کیسے دیکھتی ہے تو؟... کھسوا کی طرف؟..."

"وہ تو ہمارا مرد ہے حکم۔"

نتی تائی نے بچا لیا نہیں تو پتہ نہیں اور کتنی دیر کھڑا رہنا پڑتا حضور میں — "ڈلیا چل روٹی ڈال دوں تجھے۔ اب اسے جانے دیجئے حکم۔ زیادہ دیر نہیں کرتے۔"

"ہوں..." مہاراج نے ہنکارا مار کے پوچھا۔ "پیٹ بھر کے کھانے کو دیتی ہے نا اسے؟"

"تین روٹی اور گڑ کہا ہے ملکن نے —"

ڈلیا نے پوچھنے کی ہمت کی "میں روٹی گھر لے جاؤں حکم؟ گھر جا کے کھاؤں گی!"

"کھسوا کے ساتھ؟"

اثبات میں سر ہلا دیا ڈلیا نے... "جی!"

Scanned by CamScanner

''تائی... باندھ دے روٹیاں اسے اور گن کے مت باندھنا۔ چنگیز بھر کے دے دے۔''

کھسوا کو حویلی کا مکھن کھلا کے بہت اچھا لگا ڈلیا کو۔ تائی نے اتنا بڑا پیڑا رکھ دیا تھا روٹی میں...

''رانی جی نے کچھ کہا نہیں؟'' کھسوا نے پوچھا۔

''اب سب کچھ رانی جی کے سامنے تھوڑا ہی ہوتا ہے!'' اپنی مکھن لگی انگلیوں سے ڈلیا نے کھسوا کی مونچھوں کو ایک اور بل دیا...

بادل روز روز امڈ کے آتے تھے اور پھر پتہ نہیں کہاں گھل جاتے تھے آکاش میں... ماروتھل پر بھیگی بھیگی ہوا کی ایک تہہ سی جم گئی تھی... زمین نرم پڑنے لگی تھی۔ کھیتوں پر ایک کی جگہ ڈیڑھ دیہاڑیاں لگنے لگی تھیں کھسوا کی اور اتنے سالوں میں کھسوا نے پہلی بار گھر کا مٹکا اناج سے بھرا دیکھا۔

ڈلیا رانی جی کے بالوں میں تیل لگا رہی تھی۔ جب مہاراج بنا کھنکارے چلے آئے کمرے میں اور آکے سامنے ہی براجمان ہو گئے۔

''تمہارے ماما جی کی لڑکی کی شادی ہے۔''

''شیلا کی؟...''

''ہاں اسی کی... اور تمہیں بلایا ہے ابھی سے!''

''آپ بھی تو چلیں گے۔''

''ہم ابھی سے جا کر کیا کریں گے؟ آپ چلے جاؤ اور میکے بھی رہ لینا کچھ دن... ماں صاحب بہت یاد کرتی ہیں...''

''اور اتنے سارے دن آپ کا خیال کون رکھے گا؟''

''یہ ہے نا، یہی دیکھے گی! کیوں ڈلیا؟ یہیں رہ جائے گی تائی کے ساتھ!''

ڈلیا کے تو پسینے چھوٹ گئے اور مہاراج کی مسخری ہو گئی— رانی جی بولیں ''اس کا کھسم نہ ہوتا پیچھے تو میں ساتھ ہی لے جاتی اسے!''

''کھسم کا ہے کا؟'' مہاراج بولے۔ ''شراب کی بوتل ہے ادھر ادھر لڑھکتا رہتا ہے...''

دو ہی دن میں رانی جی کے جانے کا انتظام ہو گیا۔ کاروں کا ایک قافلہ ہی نکل پڑا، دیوان جی خود چھوڑنے گئے—

رانی جی کے جانے کے بعد ڈلیا کئی دن حویلی پر نہیں گئی۔ تائی نے کہلایا بھی تو جان بوجھ کے چوک کر گئی۔

Scanned by CamScanner

کھسوا کو بھی روپیہ اٹھنی زیادہ ملنے لگا تھا۔ دیوان خانے سے اور جب سے گھر میں منگلی اناج سے بھری رہنے لگی تھی۔ اس کی دارو بڑھ گئی تھی۔ کئی بار ڈلیا ٹھیکے سے اٹھا کے لائی تھی رات کو۔ ایک روز پی کے گاؤں کے پروہت سے جھگڑا مول لے لیا اور غصے میں مندر کے دروازے پر تھوک دیا۔ بس آگ لگ گئی سارے گاؤں میں۔ تھانے والوں نے پکڑ کے خوب ٹھکائی کی اور بند کر دیا۔ ڈلیا دس بار گئی تھی تھانے۔ کھسم کی حالت دیکھ دیکھ کر غش آتا تھا۔ پر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ہار کے حویلی پر لوٹ آئی۔

ڈلیا سارا دن حویلی کے دروازے پر بیٹھی بیٹھی چوکھٹ ہوگئی۔ جب چراغ جلے، تب آئی نیتی اور اٹھا کے اندر لے گئی۔ پہلے منہ ہاتھ دھلایا پھر اچھا کچھ کھانے کو دیا اور جب کپڑے بدلنے کو کہا تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ایک پل میں سب سمجھ گئی... نیتی کی آنکھوں میں سب لکھا تھا—

نیتی نے بڑے دھیمے سے کہا "بدل لے، کھسوا کو اس بار بہت دن اندر رہنا پڑے گا کیا پتہ— کیا ہو؟" کہتے کہتے اس کی آواز کپکپا گئی— "میں بھی ایسے ہی آئی تھی— بڑے مہاراج کے پاس اور یہیں رہ گئی حویلی میں— واپس جانے کو کچھ بچا ہی نہیں— کچھ چھوڑا ہی نہیں مہاراج نے!— چل اٹھ بدل لے چولی!!"

ڈلیا نے بورائی آنکھوں سے دیکھا چاروں طرف۔ حویلی کے پیٹ میں پڑی تھی— اور کسی کی پکارنے کی آواز آ رہی تھی—!

Scanned by CamScanner

خوف

خوف سے اس کی نسیں تن رہی تھیں اور بیٹھے بیٹھے گھٹنے یوں کانپ جاتے تھے جیسے مرگی پڑنے والی ہو۔ شہر میں دنگے چلتے چار دن ہو گئے تھے۔ کرفیو کچھ دیر کے لیے صبح کھلتا تھا، کچھ دیر کے لیے شام کو۔ کرفیو کھلتا تو کچھ لوگ جلدی جلدی روزمرہ کی ضرورت کا سامان خریدتے۔ کچھ لوگ جلدی جلدی مار دھاڑ کرتے۔ آگ لگاتے۔ چاقو چلاتے اور کچھ لاشیں گرا کر کرفیو شروع ہونے سے پہلے ہی اپنے گھروں میں آ کر بند ہو جاتے۔ بمبئی میں گرم گرم خبریں اور گرم گرم لہو مسلسل بہہ رہا تھا۔ لیکن ریڈیو اور ٹی وی باقاعدہ اناؤنس کر رہے تھے کہ شہر کی حالت قابو میں ہے اور حالات نارمل ہوتے جا رہے ہیں۔

حالات نارمل ثابت کرنے کے لیے کل سے لوکل ٹرینیں بھی دیر تک چل رہی تھیں۔ بیشتر ڈبے خالی تھے۔ لیکن روشنیاں پٹریوں پر دوڑتی ہوئی نظر آئیں تو چار دن کے منجمد اندھیرے میں ذرا جنبش ہوئی۔ ریلوے ٹریکس کے دونوں طرف کی بستیوں میں جو سناٹا پھیلا گیا تھا، وہ ٹرین کے گزرنے سے کچھ دیر کے لیے کھڑکھڑایا تو پھر سے حرکت کی امید بندھی۔ یاسین آواز بھی سنتا تھا اور اٹھ کر دیکھتا بھی تھا کہ شاید گاڑی چلنے لگی ہے۔ کل پانچواں دن ہوا۔ وہ اپنے گھر سے غائب تھا۔ اب تو انتظار ختم ہو چکا ہوگا اور اس کی تلاش شروع ہو گئی ہوگی۔ دن ختم ہونے ہی والا تھا کہ یاسین کا صبر ٹوٹ گیا۔ شام کا کرفیو کھلتے ہی وہ اندھیری کے اسٹیشن پر پہنچ گیا۔ پلیٹ فارم سنسان تھا لیکن انڈیکیٹر پر ٹرین کا وقت ٹمٹما رہا تھا۔

ٹرین بہت آہستہ سے اسٹیشن میں داخل ہوئی، روزمرہ کے اسٹائل سے نہیں جیسے محتاط تھی یا ڈری ہوئی سہمی ہوئی۔ کچھ لوگ تھے بھی ٹرین میں۔ اکا دکا۔ وہ فیصلہ نہیں کر پایا کہ کس ڈبے میں داخل ہو۔ اکثریت تو ہندوؤں کی ہے نا۔ دو دو چار چار کے گچھوں میں کہیں کہیں گتھے ہوئے رکھے تھے۔ وہ پلیٹ فارم پر رکا رہا اور جب گاڑی چلنے لگی تو ایک دم بھاگ کر چڑھ گیا۔ اس نے وہی ڈبہ چنا جس میں اور کوئی نہ ہو۔ بغور دیکھا چاروں طرف کوئی نہیں تھا۔ پھر ڈبے کی آخری بینچ پر کونے والی سیٹ

Scanned by CamScanner

میں جا کر ڈوب گیا۔ جہاں سے وہ پورے ڈبے پر نظر رکھ سکے۔ ثرین نے رفتار پکڑی تو اس کی سانس میں سانس آئی۔

اچانک ڈبے کے دوسرے کونے سے ایک منڈی نمودار ہوئی۔ یاسین کے تو ہوش اڑ گئے۔ گھٹنوں میں پھر سے مرگی دوڑ گئی۔ جھک کر سیٹ کے اتنے نیچے ہو گیا کہ اگر وہ اس طرف آئے تو فوراً بینچ کے نیچے چھپ جائے یا تن کے سامنے کھڑا ہو جائے۔ پوزیشن لے لے۔

ڈبے کا دروازہ بھی دور نہیں تھا۔ لیکن چلتی گاڑی آہستہ ہو بھی گئی تو وہ شخص...

اچانک وہ شخص اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ کھڑے کھڑے ہی اس نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن اس کے چہرے پر ڈر یا خوف کے آثار نہیں تھے۔ وہ یقیناً ہندو تھا۔ یاسین کا پہلا ری ایکشن یہی تھا... ٹہلتا ہوا وہ گاڑی کے پرلے دروازے پر کھڑا ہو گیا۔ ہوا سے اس کا مفلر پھٹے جھنڈے کی طرح لہرا رہا تھا۔ کچھ دیر وہ باہر جھانک کر دیکھتا رہا۔ پھر لگا کہ کسی چیز کے ساتھ زور آزمائی کر رہا ہے— یاسین جہاں بیٹھا تھا وہاں سے صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوئی چیز وہ کھینچ رہا تھا۔ کبھی دباتا تھا۔ کبھی اٹھاتا تھا۔ کبھی کھینچتا تھا۔ یاسین کو لگا کچھ توڑ رہا ہے کہ اچانک ایک زنگ آلود دروازہ زور سے گھسٹا اور ایک پر زور کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ بند ہو گیا۔ اچھا ہوا یاسین کے منہ سے چیخ نہیں نکل گئی— لیکن اس آواز سے وہ شخص خود بھی چونک گیا تھا۔ اس نے دیکھا تھا چاروں طرف اور اس طرف کچھ زیادہ دیر تک دیکھتا رہا جہاں یاسین چھپا ہوا تھا۔ یاسین کو شک ہوا کہیں دیکھ ہی تو نہیں لیا اس نے؟ یا آہٹ پا گیا ہو؟ اس شخص کی زور آزمائی نے یاسین کے کلیجے میں ایک اور دہشت بیٹھا دی۔ اگر آمنا سامنا ہو جائے تو کیا وہ اس کا مقابلہ کر پائے گا؟ وہ شخص ٹہلتا ہوا دوسری طرف کے دروازے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی جوگیشوری کا ایک سنسان اسٹیشن پھلانگ گئی۔ گاڑی رک جاتی تو شاید وہ اتر ہی جاتا۔ لیکن یہ تو کرفیو کا علاقہ تھا اس لیے گاڑی وہاں نہیں رکی۔ کرفیو کا علاقہ ہی زیادہ محفوظ ہوتا۔ کم سے کم وہاں پولیس تو ہوتی اور اب تو ملٹری بھی بلوائی جا چکی تھی۔ شہر میں فساد زدہ علاقوں میں ان کے ہرے خاکی چکتوں والے گھومتے ہوئے نظر آ جاتے اور ان پر اسی رنگ کی وردیاں پہنے فوجی اپنی بندوقوں رائفلوں کی نالیاں باہر نکالے رکھتے۔ پولیس تو بیکار ہو گئی تھی۔ اب ان سے کوئی ڈرتا بھی نہیں تھا۔ ہجوم بے دھڑک ان پر پتھر اور سوڈا واٹر کی بوتلیں پھینکتا تھا اور اب تیزاب کے بھرے بلب بھی۔ پولیس اگر آنسو گیس کی گولیاں بھی چھوڑتی تو ہجوم کے لوگ گیلے رومال سے اٹھا کر وہی پولیس پر واپس پھینک دیتے تھے۔ ''ساکی ناکا'' میں جب وہ بیکری جلی جس میں وہ کام کرتا تھا، کیا کیا تھا پولیس نے؟ دور کھڑی تماشا دیکھتی رہی اور وہ پتلی سی گلیوں بچتے بھاگتے ان

Scanned by CamScanner

گیرجوں کی طرف دوڑے تھے جدھر ٹھونکی پیٹی چھلی ادھ چھلی موڑوں کے ڈھانچے کھڑے رہتے تھے۔ جان بچا کر بھاگتے تھے چھپنے کے لیے— آٹھ دس لوگ تھے وہ۔ بھلا ہو بھاؤ کا، بھاگتے بھاگتے اس کی کمر کا گمچھا پکڑ کے چائے والے کے بانکڑے میں کھینچ لیا۔ بھاؤ کو تو معلوم تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ لیکن وہ تو ہندو ہے، وہ کیوں بھاگا؟ بھاؤ کہہ رہا تھا "جب ہجوم کے سر خون چڑھا ہو تو وہ نام پوچھنے کے لیے نہیں رکتے۔ ان کی پیاس خون سے بجھتی ہے یا آگ سے، جلا دو۔ مار دو، نیست و نابود کر دو۔ ان کا غصہ تبھی ٹھنڈا ہوتا ہے جب سامنے کچھ نہ رہے۔"

دوسرے دروازے کی کھڑکھڑاہٹ نے اسے چونکا دیا۔ ڈبے کے پرلی طرف کے دونوں دروازے اس شخص نے بند کر دیے تھے اور دیر تک اس طرف دیکھتا رہا جس طرف یاسین چھپا ہوا تھا۔ خوف نے پھر اس کا سرا اپنے شکنجے میں لے لیا۔ وہ آدمی دروازے کیوں بند کر رہا ہے ڈبے کے۔ کیا اسے مار کے اس کی خون میں لتھڑی لاش وہ اسی ڈبے میں چھوڑ کر اتر جائے گا۔ اگلے اسٹیشن پر! ٹرین اب آہستہ ہو رہی تھی۔ کوئی اسٹیشن آ رہا تھا۔ اس آدمی کے قدموں میں پہلے سے زیادہ خود اعتمادی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کی طرف آ رہا تھا۔ یاسین کی سانس بھاری ہو گئی۔ ماتھے پر ٹھنڈے پسینے کی آمد محسوس کر رہا تھا۔ ڈر تھا۔ سانسیں گچھا ہو رہی تھیں۔ تھوک نگلا نہیں جا رہا تھا۔ کہیں اسے چھینک اچھو نہ ہو جائے۔ وہ کھانس نہ دے ورنہ یہیں سیٹ کے نیچے پڑے پڑے...

گاڑی رکی۔ کوئی اسٹیشن آیا تھا۔ وہ آدمی آرام سے اس دروازے پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ جس طرف پلیٹ فارم تھا۔ اس کا ایک ہاتھ اس کی جیب میں تھا۔ جیب میں کوئی ہتھیار ہو گا۔ پستول یا چاقو؟— یاسین نے سوچا بھاگ کے دوسری طرف کے دروازے سے باہر کود جائے۔ لیکن جہاں چھپا تھا وہاں سے نکلتے نکلتے تو وہ آدمی اس کا پیٹ چاک کر دے گا۔ پیٹ ہی کیوں؟ گلا کاٹ دے گا تاکہ آواز بھی نہ نکلے۔ چور آنکھ سے اس نے جھانک کر دیکھا۔ وہ شخص باہر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پلیٹ فارم پر سناٹا تھا۔ کسی کے قدموں کی آواز بھی نہیں آئی۔ یاسین نے بہت چاہا کہ کوئی آ جائے۔ لیکن کیا پتہ کون آئے؟ ہندو؟ یا مسلمان؟ ایک اور ہندو ہی سہی۔ شاید بھاؤ جیسا کوئی رحم دل ہو۔ چائے کے بانکڑے سے کیسے اپنے جنیئو پہنا کر وہ اسے اپنی کھولی تک لے گیا تھا۔ چار دن تک رکھا۔ اس نے کہا تھا... "میں مراٹھا ہوں یاسین! لیکن روز گوشت نہیں کھاتا۔ تم کہو تو لے آؤں۔ پتہ نہیں کیسا ملے۔ حلال و لال میں سمجھتا نہیں اور باہر کی حالت یہ ہے کہ سبزیاں سڑ رہی ہیں اندھیری میں لیکن بیچنے والا کوئی نہیں۔ لوٹ لو تو جتنی چاہو لے جاؤ—"

اور ریڈیو یہی کہہ رہا تھا شہر کے حالات آہستہ آہستہ نارمل ہو رہے ہیں۔ گاڑیاں چل رہی

Scanned by CamScanner

ہیں۔ کچھ علاقوں میں بسیں بھی جاری کر دی گئی ہیں۔ ان چار دنوں میں اسے گھر والوں کی بہت فکر ہوئی۔ گھر والے بھی اس کی فکر کرتے ہوں گے۔ اسے ایک ڈر تھا... کہیں فاطمہ اسے ڈھونڈنے کے لیے بیکری کے پتے پر نہ چلی جائے۔ جس کھولی میں چھپا تھا، وہاں سے ریل کی پٹری نظر آتی تھی۔ گاڑیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ لیکن بھاؤ نے اسے جانے نہیں دیا۔

گاڑی ایک دھچکے سے چلی اور یاسین کھولی سے ڈبے میں آ گرا۔ وہ شخص بائیں ہاتھ سے راڈ پکڑے بڑی خود اعتمادی سے کھڑا تھا۔ اس کا دایاں ہاتھ ابھی تک جیب میں تھا۔ گاڑی تھوڑی دور تک سرکتی گھسٹتی چلتی رہی۔ یہ گاڑی رفتار کیوں نہیں پکڑ رہی، سگنل نہ ملنے کی تو کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ پٹریوں پر ٹریفک ہی کہاں ہے؟ ابھی تک کوئی گاڑی دوسری طرف سے نہیں گزری، گاڑی بہت دیر تک گھسٹتی رہی گھسٹتی رہی اور جہاں آ کر رکی وہ بھسندر کا پل تھا۔ نیچے سمندر کی کھاڑی تھی جہاں سے اکثر لاشوں کے نکلنے کی خبریں اخباروں میں چھپا کرتی تھیں۔

یاسین کا دم گھٹنے لگا۔ اس خوف میں جینا مشکل تھا اور وہ شخص جیب سے ہاتھ کیوں نہیں نکالتا؟ اس کی آنکھوں سے پتہ چلتا ہے کہ حملہ کرنے والا ہے۔ کیا ہوگا جب حملہ کرے گا؟ اسے باہر نکلنے کے لیے کہے گا؟ یا سر کے بالوں سے پکڑ کے گھسیٹ لے گا اور زپ سے چاقو اس کے گلے پر رکھ دے گا۔ کیا کرے گا وہ؟... اور کچھ کرتا کیوں نہیں؟

اس وقت اس شخص نے جیب سے ہاتھ نکالا اور پھر زور آزمائی کرنے لگا۔ وہ تیسرا دروازہ بھی بند کر رہا تھا اور نیچے کھاڑی تھی۔ کود جائے تو موت یقینی تھی۔ خوف اب حد تک پہنچ رہا تھا۔ گچھا بند ہو رہی تھی۔

اچانک کود کر وہ باہر نکل آیا۔ چونک کر دیکھا اس آدمی نے ہاتھ جیب میں ڈالا اور پتہ نہیں کہاں سے اتنی طاقت آ گئی یاسین میں "یا علی" کہہ کر اس آدمی کو ٹانگوں کے بیچ سے اٹھا لیا اور باہر پھینک دیا۔ نیچے گرتے گرتے اس کی چیخ سنائی دی۔

"اللہ..."

یاسین کھڑا رہا۔ گاڑی چل دی... یاسین کو حیرت ہوئی۔

"کیا مسلمان تھا وہ بھی؟"

لیکن خوف کے شکنجے سے جو چھوٹا تھا تو ایسے جیسے موت کے منہ سے واپس آیا ہو...!

اس رات وہ فاطمہ سے کہہ رہا تھا... "اگر ایسا نہ ہوتا تو میں بھی مسلمان ہونے کا فوراً کیا ثبوت دیتا اسے؟"

Scanned by CamScanner

سانجھ

لالہ جی کو یہ بات کھل گئی کہ بڑھیا (لالائن) نے بال کٹوا دیئے اور ان سے پوچھا بھی نہیں۔ پچھلے مہینے ان کی بہو میکے گئی تھی تو اپنی ساس کو ساتھ لے گئی تھی دلی کہ ٹرین میں گود کے بچے کو سنبھالنے میں آسانی رہے گی۔

لالہ جی سے خود مایا دیوی نے پوچھا تھا... ''بہو کہہ رہی ہے دلی چلنے کے لیے۔ جاؤں؟''

''ہاں ہاں ضرور جاؤ۔ ٹرین کے دھکم دھکے میں بیچاری بہو کیسے سنبھالے گی بچے کو؟''

ان کی بہو، منی کے پتا رٹائرڈ کرنل ہیں۔ منی کے دو بھائی بھی ملٹری میں بڑے عہدوں پر ہیں۔ کرنل صاحب کا پارٹیوں میں آنا جانا آج بھی اسی طرح جاری ہے۔ ظاہر ہے ان کی پتنی انہی کے اسٹائل میں رہتی ہیں۔ ماڈرن ہیں۔ سٹائلش ہیں۔ انہوں نے بال کٹوا رکھے ہیں، اس بار مایا دیوی کے بھی کٹوا دیئے۔

دو ہفتے بعد بمبئی واپس لوٹیں تو لالہ دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ ''یہ بالوں کا کیا کیا تم نے؟''

''سمدھن نے کٹوا دیئے۔ اپنی طرح کے بنوا دیئے۔'' یہ کہہ کر مایا ہنسیں ضرور لیکن ایک سایہ جو گزرا، ان کے پتی کی آنکھ سے، وہ ڈر گئیں۔ اپنے شوہر کی نظر وہ پہچانتی تھیں۔ اڑتالیس برس کا ریاض تھا۔ کھسیانی سی بولیں — ''پھر رکھ لوں گی، بڑھ جائیں گے۔''

لالہ جی چپ چاپ اندر چلے گئے اور بیٹھک میں جا کر بیٹھ گئے۔

رات کھانے کی میز پر بھی ان کا موڈ بجھا بجھا ہی رہا۔ منوج نے پوچھا۔ منی نے بھی بس سر ہلا دیا۔ ''کچھ نہیں''

مایا دیوی نے جب پوچھا... ''طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' تو جواب کچھ اور ہی دیا...

''تمہارے بال تو بہت اچھے تھے خوبصورت تھے کٹوا کیوں دیئے؟'' کوئی جواب نہ ملا تو بولے...

''اور تم نے... مجھ سے پوچھا بھی نہیں!''

منوج ہنستا ہوا کمرے میں داخل ہوا — ''بابو جی کو ابھی تک ماں کے بالوں کی فکر لگی ہے۔ ستر

Scanned by CamScanner

بہتر کے ہو گئے لیکن مزاج سے عشق نہیں گیا ابھی!"

منی نے جو بڑی کی کنگھی کر رہی تھی، ہنس کر پوچھا— "بابو جی کی کیا لو میرج ہوئی تھی؟"

"نہیں ماں کی شادی تو میرے سامنے ہوئی۔ ان کے ماں باپ نے کروائی تھی۔"

"مطلب؟..."

"دونوں نے گھر سے بھاگ کے کورٹ میں شادی کر لی تھی۔ چار پانچ سال کے بعد میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کے بعد دونوں کے ماں باپ نے معاف کر دیا اور صلح ہو گئی... ماں مجھے لے کر پیرنٹس (والدین) کو ملنے گئی تو انہوں نے بابو جی کو گھر سے نکال دیا۔ یہ کہہ کے کہ بچو جاؤ۔ اب برات لے کر آؤ تب لڑکی دیں گے۔ تب دوبارہ شادی ہوئی ان کی۔ مجھے یاد تو نہیں۔ لیکن— پتہ ہے۔ تصویر بھی ہے۔"

لالہ بیم راج کو کھانے کے بعد سیر کی پرانی عادت تھی۔ کچھ دیر ٹہلنے کے لیے باہر چلے جاتے تھے۔ نکڑ سے ایک پان بنواتے اپنی پسند کا۔ عمر کے ساتھ سپاری ضرور کم ہو گئی تھی۔ لیکن ایک روز وہ پنواڑی کی دکان سے پہلے ہی لوٹ آئے۔ اتنی سی بات پتہ نہیں کیوں بھنور کی طرح ان کی سوچ میں اٹک گئی تھی— سانجھ ہی تو ہے۔ اسے حق کہہ لو، ادھیکار کہہ لو یا— کوئی مناسب لفظ ملا نہیں۔ ایسا لگ رہا تھا ان کی بڑی قیمتی چیز چوری ہو گئی ہے۔

جب منوج پیدا ہوا تھا تو پہلے پہل ان کے ادھیکار پر سیندھ لگی تھی۔ مذاقاً بیوی سے کہا...

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے بھئی ہم خود ہی کپڑے نکال لیں گے۔ تم دیکھو اپنے بیٹے کو۔ آتے ہی ہمارا بستر الگ کروا دیا اس چھٹنکی بھر لونڈے نے!"

"چھٹنکی بھر مت کہو۔ آٹھ پونڈ کا بیٹا دیا ہے آپ کو۔"

"لیکن یہ تو بتا دو پہنوں کیا؟ بلتن صاحب کے یہاں جانا ہے۔"

"نکلائی تو ہرگز مت لگانا۔ بری اوت لگتی ہے آپ کے گلے میں۔ سکارف لگا کے چلے جاؤ۔"

پھر پنکی پیدا ہوئی تو کچھ اور کٹاؤ ہوا، ان کے ادھیکار کا۔ کھانا نوکرانی کے ہاتھ کا ملنے لگا۔ لیکن دال کا بگھار مایا خود لگاتی تھیں۔ کوئی اور لگائے تو انہیں فوراً پتہ چل جاتا تھا۔ مایا دیوی کو بڑا فخر تھا اس بات پر۔ ایک بار دال میں سے لمبا سا بال نکل آیا۔ لالہ جی نے نوکرانی کو نکال دیا۔ مایا سے بولے... تمہارا بال ہوتا تو میں بٹوے میں رکھ لیتا۔ لیکن میں اس نوکرانی کے بال برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے کہو کام کرنا ہے تو سر منڈوا کے آئے۔"

"آئے ہائے۔ سہاگن بچاری۔ وہ کیوں سر منڈا دے؟ کوئی ودھوا ہے؟"

Scanned by CamScanner

''تو پھر کوئی نوکر رکھ لو۔''

تب سے نوکر ہی رہا گھر میں... اب آ کے چولھا چوکا بہو نے سنبھالا تو ایک دن اسے بھی کہہ دیا... ''کھانے بناتے ہوئے بال کھلے مت رکھا کرو بیٹی۔ آنکھ پر آتے ہیں۔''

منی نے کس کے جوڑا بنالیا۔ لیکن بات مایا کی نظر سے بچ نہ سکی۔ وہ جان گئی تھی کہ آج تک نوکرانی والی بات وہ بھولے نہیں۔

دو چار روز تو ہنسی مذاق میں ٹلتی رہی۔ ماں دل ہی دل میں اترا بھی رہی تھی کہ لالہ جی اس بڑھاپے میں بھی اپنا عشق جتا رہے ہیں۔ روٹھے سے رہتے ہیں۔ لیکن کچھ روز اور گزرے تو سب نے دیکھا کہ بابو جی نے ماں سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ مایا بھی کچھ بے حال ہونے لگیں۔ بڑھاپے کی روٹھائی انہیں جوانی سے بھی زیادہ جان لیوا لگنے لگی۔ کھانے کی میز پر سب ملتے اور لالہ جی چپ چاپ کھانا کھا کر اٹھتے اور سیر کو نکل جاتے۔ سیر بھی کچھ چھوٹی ہونے لگی تھی۔ مایا نے پوچھا تو جواب دیا ''اب جلدی تھک جاتا ہوں!''

ایک بے دلی سی رہنے لگی گھر میں۔ ساتھ ہی ایک دبا دبا سا تناؤ بھی شروع ہو گیا۔ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے منوج نے کہا... ''بابو جی آپ چشمے کا فریم بدل لیجئے۔ آج کل بڑے نئے نئے ڈیزائن ملتے ہیں...''

''یہ ڈیزائن تمہاری ماں کا پاس کیا ہوا ہے بھئی۔''

''ماں کا؟'' منی نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں! انہیں گول فریم اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہم نے چورس لے لیا۔ پھر کالے فریم پر اعتراض ہوا انہیں تو ہم نے براؤن لے لیا!''

ایک روز کھانے پر بیٹھے تو چونک کر دیکھا مایا کی طرف۔ ''آج بگھار تم نے لگایا ہے؟''

مایا کا جی بھر آیا۔ بہو نے پوچھا.. ''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''ارے بیٹی تمہاری ساس کے بگھار میں ہمیں ان کے ہاتھوں کی خوشبو آ جاتی ہے۔''

لیکن ان کی خاموشی برقرار رہی جب دبی دبی منوائی کا بھی اثر نہ ہوا تو منی نے ایک دن صاف صاف معافی مانگ لی — ''مجھ سے غلطی ہو گئی بابو جی۔ میں اپنی ممی کو منع نہیں کر سکی اور ممی بھی تو مان ہی گئیں!'' وہ دونوں کو ممی کہتی تھی۔ ماں کو بھی اور ساس کو بھی۔

ایک دبی مسکراہٹ کے ساتھ بابو جی بولے — ''باتیں بڑی معمولی ہیں بیٹا۔ نہ ہونے سے کوئی دنیا ادھر کی ادھر نہیں ہو جاتی۔ لیکن زندہ رہنے کا رس بنا رہتا ہے بس۔ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔

Scanned by CamScanner

ایک دوسرے سے بیگانے تو نہیں ہو گئے۔"

اگلے دن ہی بابو جی نے کہا "میں کچھ دن کے لیے پنکی کے پاس رہ آتا ہوں — ذرا تبدیلی ہو جائے گی۔"

پنکی جبل پور میں بیاہی ہوئی تھی۔ معمولی سے پس و پیش کے بعد سب مان بھی گئے۔ منوج نے تو مذاق بھی کیا۔ "ٹھیک ہے جب تک ماں کے بال بھی کچھ اور لمبے ہو جائیں گے۔"

ماں نے سمجھایا بیٹی کے ہاں زیادہ دن مت رک جانا۔ اچھا نہیں ہوتا — جلدی لوٹنا۔"

دوسرے دن لالہ جی ٹرین سے روانہ ہو گئے۔

دو دن، چار دن، چھ دن، ہفتہ گزر گیا لیکن لالہ جی جبل پور نہیں پہنچے۔ سب کو فکر ہو گئی۔ دوستوں، رشتہ داروں کے ہاں کھوج شروع ہوئی۔ خدا نہ کرے کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو راستے میں۔ کچھ ہوتا بھی تو لالہ جی خبر کرتے۔ کوئی معقول وجہ ان کے غائب ہونے کی سمجھ میں نہ آئی۔ بہت مایوس ہونے کے بعد پولیس کو اطلاع دی گئی اور اخباروں میں تصویر چھاپ دی گئی — مگر سراغ ندارد! پریشانی اس حد کو پہنچی کہ ممکن ناممکن ہر طرح کے خیالات ذہن سے گزرنے لگے —

ڈھائی مہینے گزر گئے اور ایک دن اچانک ایک خط ملا۔ بدری ناتھ کے کسی آشرم سے — لالہ ہیم راج بہت بیمار تھے۔ ان کی حالت بہت نازک تھی اور آشرم کے کسی پنڈت نے ان کی ڈائری سے پتہ لے کر خط لکھ دیا تھا۔

سب لوگ فوراً بدری ناتھ پہنچ گئے — بس ذرا سی دیر ہو گئی۔ اسی صبح ان کا دیہانت ہو گیا تھا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بڑھ کے جٹائیں بن گئی تھیں۔ چٹائی پر پڑے ہوئے بالکل سنیاسی لگ رہے تھے۔

مایا دیوی نے چوڑیاں توڑ کے پھینک دیں اور ان کے کان کے پاس جا کر پوچھا "اب بتاؤ — بال کٹوا دوں؟ اب تو منڈن کروانا ہو گا۔ ودھوا ہوں نا!"

اور اس بار لالہ جی سے پوچھ کے بڑھیا نے سر منڈوا دیا...!

Scanned by CamScanner

مرد

وہ پریشان تھی۔ اس کا پیٹ تھوڑا تھوڑا نظر آنے لگا تھا۔ کپو ہوسٹل سے آنے والا تھا۔ اگر پوچھ بیٹھا تو؟ وہ ایسے ڈر رہی تھی جیسے کپو اس کا بیٹا نہیں، خاوند ہو۔ صفائی دینی پڑے گی۔

عورت کچھ بھی کرے، ہر بار کسی نہ کسی مرد کو صفائی دینی پڑ جاتی ہے۔ کبھی باپ کو، کبھی خاوند کو، کبھی بیٹے کو۔ بخشی نے تو کوئی صفائی نہیں دی تھی۔ جب وہ کانتا سے ملنے جانے لگا تھا۔ بلکہ وہ کبھی پوچھ لیتی تو گھر کے برتن ٹوٹنے لگتے تھے۔ کبھی کبھار ہاتھا پائی بھی ہو جاتی تھی۔ انہی دنوں میں تلخی بڑھنے لگی تھی تو دونوں نے ایک ساتھ سوچا تھا کہ کپو کو ہوسٹل میں ڈال دیا جائے۔ تاکہ برتنوں کے ٹوٹنے میں وہ گھر ٹوٹنے کا منظر نہ دیکھے۔ بخشی کو جب کانتا ملی تو اس کے حواس بڑی تیزی سے خراب ہوئے۔ رما جان گئی تھی کہ اب گھر نہیں بچے گا اور وہی ہوا ٹیلیفون کی گھنٹی بجنا اور بج کے فوراً بند ہو جانا، پھر فوراً بخشی کا فون کرنا۔ بے وقت دفتر کا کام نکل آنا۔ یہ ساری علامتیں وہ جانتی تھی۔ سمجھ رہی تھی...

بخشی گھر سے غائب رہنے لگا۔ دفتر کے دورے تو بہانہ تھے۔ وہ ہمیشہ اچھی طرح جانتی تھی۔ بخشی کب، کہاں، کس ہوٹل میں ہے۔

ایک سال کے اندر اندر اس نے دوبارہ بینک میں نوکری کر لی، جہاں پہلے کام کرتی تھی۔ لیکن صفائی پھر بھی دینی پڑی تھی۔ اپنے باپ کو بھی اور بخشی کو بھی۔ بلکہ بخشی نے اسکے ڈیڈی کو منانے میں مدد بھی کی تھی۔ کیونکہ وہ بھی جانتا تھا ایک نوکری میں دو گھر چلانے اس کے لیے مشکل ہوں گے۔

باپ نے جب الگ لے جا کر پوچھا تھا رما سے... "کیا کوئی فرق آ گیا ہے تم دونوں میں؟"... تو بڑی فرماں برداری سے اس نے کہا تھا... "نہیں ڈیڈی یوں تو گھر گرہستی میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن کپل کے ہوسٹل چلے جانے سے میں بہت خالی رہنے لگی ہوں۔"

باپ نے اس سے زیادہ کچھ نہیں پوچھا۔ صرف اتنا ہی کہا تھا... "کپل کو کبھی کبھی نانا نانی کے پاس بھیج دیا کرو۔"

دونوں "جی ضرور!" کہہ کے کانپور سے واپس آ گئے تھے۔

Scanned by CamScanner

صفائی مانگنا اور صفائی دینا دونوں ہی چھوڑ دیا تھا۔ جب بات کھل ہی گئی تو صفائی کیسی؟ دونوں نے سمجھوتہ کرلیا کہ صلح صفائی کے ساتھ الگ ہو جائیں۔ لیکن سوال کپو کا تھا۔ اسے کیسے بتائیں؟ کیسے سمجھائیں کہ ان دونوں میں ہوا کیا ہے؟ بچہ ہی تو تھا۔ نو برس کا تھا اس وقت۔

رما کے بینک منیجر رمن کمار نے بیچ میں پڑ کے مٹ مٹاؤ کی بہت کوشش کی۔ لیکن بات بنی نہیں۔ بخشی کی اس جنونی کیفیت سے وہ واقف تھی۔ اسکے ساتھ بھی اسی طرح عشق کیا تھا اس نے۔

رمن کمار نے ایک بار کہا بھی تھا رما سے... ''تمہارا رونا تو میں سمجھ رہا ہوں۔ لیکن مجھے زیادہ حیرت ہوتی ہے جب میں بخشی کو دیکھتا ہوں۔ بات کرتے کرتے اسکی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ تمہارے خلاف کبھی ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ گلٹی بھی محسوس کرتا ہے۔ لیکن... شاید بہت جذباتی انسان ہے۔''

وہ جانتی تھی، بخشی کی یہ حرکت غلط تو ہو سکتی ہے لیکن جھوٹی نہیں — اس میں بناوٹ نہیں تھی۔

طلاق کے کاغذات کچہری میں داخل کرتے کرتے سال اور بیت گیا۔

کبھی الگ الگ اور کبھی ایک ساتھ جا کر وہ کپو کو ہوسٹل میں ملتے رہے۔ چھٹیوں میں کبھی گھمانے دلی سے باہر لے جاتے اور کبھی یہ کہ کپو، رما کے پاس آکر رہتا اور بخشی دفتر کے دورے پر دلی سے باہر چلا جاتا۔ کپل یہ تو محسوس کر سکتا تھا کہ کہیں گڑبڑ ہے۔ لیکن اس کا ذہن صرف اتنا ہی کہہ پایا تھا ''پاپا اب پہلے کی طرح پیار نہیں کرتے تھے مجھے۔ آپ کو بھی!''

''ہٹ پگلا۔ دفتر کے کام میں زیادہ مصروف رہتے ہیں۔ اور کیا!'' وہ نہیں چاہتی کپو کی معصوم سوچ پر کوئی اثر پڑے۔

''اور پھر میں بھی تو کام کرنے لگی ہوں۔ بینک میں!''

جب طلاق ہوئی اور رما نے بیٹے پر اپنا حق مانگا تو بخشی نے زیادہ ضد نہیں کی۔ مان گیا۔ وہ جانتا تھا، کانتا کی موجودگی میں وہ اپنے بیٹے کو سمجھا نہیں پائے گا۔ اس کا برا اثر پڑے گا اس پر۔ وہ باقاعدہ اسے ہوسٹل میں ملنے تو جاتا رہا لیکن اس کی ماں سے علیحدگی کا کبھی ذکر نہ کیا...

کانتا بھی بہت دن نہیں چلی۔ لیکن اس کے بعد نہ رما ہی چاہتی تھی کہ بخشی لوٹ کر واپس آئے اور نہ بخشی ہی لوٹنا چاہتا تھا۔ جو دراڑ پڑنی تھی وہ پڑ چکی تھی۔ اب اس کا بھرنا ناممکن تھا اور اس سال کی چھٹیوں میں جب کپل گھر آرہا تھا تو بخشی کا تبادلہ دلی سے ہزاروں میل دور مدراس میں ہو چکا تھا۔ بخشی کو شاید یاد نہیں رہا تھا اور رما کے لیے اس ڈرامے کو اور زیادہ دیر تک قائم رکھنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کرلیا کہ کپو کو سب کچھ بتا دے گی۔ کپو کو تکلیف تو ہوگی کیوں کہ اسے اپنے باپ سے بہت لگاؤ تھا۔ لیکن وہ دھیرے دھیرے اسے تیار کرے گی۔ سارا دن اس سے باپ کی باتیں کرے گی اور

Scanned by CamScanner

رات کو جب وہ بتائے گی تو جانتی تھی وہ پھوٹ کے رو پڑے گا۔ لیکن وہ اسے منالے گی۔ سلالے گی... ''میں جو ہوں بیٹا— تیری ماں—''

کپو آیا اور ماں کے سامنے آتے ہی بولا ''ماں پاپا ہمیں چھوڑ کر چلے گئے؟ کیا یہ سچ ہے ماں؟''

رما سنبھل نہیں سکی اور پھوٹ کے رو پڑی تھی۔ کپو نے آگے بڑھ کر ماں کو گلے لگا لیا تھا۔

''میں ہوں نا ماں۔ میں جو ہوں— تیرا بیٹا—''

وہ حیران رہ گئی تھی۔ یہ بچے کب اندر ہی اندر بڑے ہو جاتے ہیں۔ پتہ ہی نہیں چلتا—!

اور آج پھر دو سال بعد کپو ہوسٹل سے لوٹ رہا تھا۔ اب تیرہ برس کا ہو چکا تھا۔

پچھلی چھٹیوں میں تو دارجلنگ چلا گیا تھا۔ اسکول کے لڑکوں اور لڑکیوں کے ساتھ اور وہ خود بھی رمن کمار کے ساتھ کچھ دنوں کے لیے باہر چلی گئی تھی۔ بہت سالوں بعد چھٹی لی تھی اس نے۔ اس بار ہولی کے دنوں میں جب وہ ملنے گئی تھی کپو سے، تو اس کا بہت جی چاہا تھا کہ رمن کا ذکر کرے۔ لیکن وہ ڈرتی تھی۔ کپو پر کوئی غلط اثر نہ پڑ جائے... آخر بچہ ہی تو ہے!!

آج بھی صبح سے کئی بار وہ سوچ چکی تھی۔ ایسا بھی کون سا مرد ہو گیا ہے کپو؟ بچہ ہی تو ہے تیرہ برس کا۔ پیٹ دیکھ بھی لیا تو سمجھ لے گا میں موٹی ہو گئی ہوں۔ اسے کیا پتہ کیا ہوا ہے؟

لیکن اس بار وہ رمن کا ذکر ضرور کر دے گی اور ہو سکا تو سمجھا دے گی کہ انہوں نے چپ چاپ شادی رجسٹر کر لی ہے۔ کچھ مہینے بعد اسے یہ بھی تو کہنا ہو گا... بہن چاہیے یا بھائی؟

کپو جب آیا تو سارا دن وہ اپنا پیٹ چھپاتی رہی۔ ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے۔ ایک بار بھی دوپٹہ الگ نہیں کیا تن سے۔ کپو کو کھلاتی پلاتی بھی رہی اور سوچتی رہی جب رات کو بستر پر اس کے ساتھ لیٹے گا تب بات شروع کرے گی۔ اچانک کمرے میں کسی کانچ کے ٹوٹنے کی آواز ہوئی۔ دوڑی دوڑی اندر گئی تو کپو نے ہاتھ زخمی کر لیا تھا۔ کانچ کا گلدان فرش پر چور چور ہو کر بکھر گیا تھا—

''کپو؟''—

وہ آگے بڑھی ہی تھی کہ کپو نے دھکا دے کر پرے کر دیا۔ ''مت آؤ میرے پاس!''

وہ ٹھٹھک کے کھڑی ہو گئی۔

کپو کا گلا رندھا ہوا تھا۔ ''تمہارے پیٹ میں بچہ ہے!''

رما کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔ ماتھے پر تری آ گئی۔

''کس کا بچہ ہے؟ رمن انکل کا؟ باسٹرڈ!!''

کپو کی نہیں، اسے بخشی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ لگا اس کا بیٹا نہیں اس کا مرد بول رہا ہے۔

Scanned by CamScanner

راوی پار

پتہ نہیں درشن سنگھ کیوں پاگل نہیں ہو گیا؟ باپ گھر پر مر گیا اور ماں اس بچے کھچے گوردوارے میں کھو گئی... اور شانتی نے ایک ساتھ دو بچے جن دیئے۔ دو بیٹے، جڑواں — اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ہنسے یا روئے۔ اس ہاتھ لے اس ہاتھ دے کا سودا کیا تھا قسمت نے۔

سنتے تھے آزادی آ چکی ہے یا آ رہی ہے۔ تو لائل پور کب پہنچے گی، پتہ نہیں چلتا تھا۔ ہندو سکھ سب چھپتے چھپاتے گوردوارے میں جمع ہو رہے تھے۔ شانتی دن رات درد سے کراہتی رہتی تھی۔ آخری آخری دن تھے زچگی کے اور پہلی پہلی اولاد —

درشن سنگھ روز نئی نئی خبریں لاتا تھا فسادات کی۔ باپ ڈھارس دیتا۔ ''کچھ نہیں ہوگا بیٹا۔ کچھ نہیں ہوگا۔ ابھی تک کسی ہندو سکھ کے مکان پر حملہ ہوا ہے کیا؟''

''گوردوارے پر تو ہوا ہے نا بھاپا جی۔ دو بار آگ لگ چکی ہے۔''

''اور تم لوگ وہیں جا کر جمع ہونا چاہتے ہو؟''

اس بات پر درشن سنگھ چپ ہو جاتا۔ پر جسے دیکھو وہی گھر چھوڑ کے گوردوارے میں جمع ہو رہا تھا —

''ایک اکٹھ ہونے سے بڑا حوصلہ ہوتا ہے بھاپا جی۔ اپنی گلی میں تو اب کوئی بھی ہندو یا سکھ رہ نہیں گیا۔ بس ہمیں ہیں — اکیلے!''

دس پندرہ دن پہلے کی بات تھی۔ رات کے وقت بھاپا جی کے گرنے کی آواز آئی آنگن میں اور سب اٹھ گئے۔ دور گوردوارے کی طرف سے ''بولے سونہال'' کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ بھاپا جی کی اسی سے آنکھ کھل گئی تھی اور وہ چھت پر دیکھنے چلے گئے تھے۔ سیڑھیاں اترتے پاؤں پھسلا اور بس — آنگن میں کھڑی کدال سر میں گھس گئی تھی —!

کسی طرح بھاپا جی کے سنسکار پورے کئے اور جو کچھ مالیت تھی ایک تکئے میں بھری اور باقی تینوں نے گوردوارے میں جا کے پناہ لی۔ گوردوارے میں خوفزدہ لوگوں کی کمی نہیں تھی اس لیے حوصلہ

Scanned by CamScanner

رہتا تھا۔ اب اسے ڈر نہیں لگتا تھا۔ درشن سنگھ کہتا... ''ہم اکیلے تھوڑا ہیں اور کوئی نہیں تو واہگورو کے پاس تو ہیں۔''

نوجوان سیواداروں کا جتھا دن بھر کام میں جٹا رہتا— لوگوں نے اپنے اپنے گھر سے جتنا بھی آٹا، دال، گھی تھا اٹھوالیا تھا۔ لنگر دن رات چلتا تھا۔ مگر کب تک؟ یہ سوال سب کے دل میں تھا— لوگ امید کرتے تھے سرکار کوئی کمک بھیجے گی۔

''کون سی سرکار؟'' ایک پوچھتا ''انگریز تو چلے گئے۔''

''یہاں پاکستان تو بن گیا ہے لیکن پاکستان کی سرکار نہیں بنی ابھی۔''

''سنا ہے یہاں ملٹری گھوم رہی ہے ہر طرف اور اپنی حفاظت میں شرنارتھیوں کے قافلے بارڈر تک پہنچا دیتی ہے۔''

''شرنارتھی؟... وہ کیا ہوتا ہے؟''

''رفیوجی!...''

''یہ لفظ تو پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔''

دو تین پریواروں کا ایک جتھا، جن سے دباؤ برداشت نہیں ہوا، نکل پڑا... ''ہم تو چلتے ہیں اسٹیشن پر۔ سنا ہے ٹرینیں چل رہی ہیں۔ یہاں بھی کب تک بیٹھے رہیں گے؟''

''ہمت تو کرنی پڑے گی بھئی۔ واہگورو موہنڈوں (کندھوں) پر تو بٹھا کر نہیں لے جائے گا؟''

ایک اور نے گروبانی کا حوالہ دیا— ''نانک نام جہاز ہے، جو چڑھے سو اترے پار۔''

کچھ لوگ نکل جاتے تھے۔ خلا کا ایک بلبلا سا بن جاتا ماحول میں۔ پھر کوئی آجاتا تو باہر کی خبروں سے یہ بلبلا پھوٹ جاتا۔

''اسٹیشن پر تو بہت بڑا کیمپ لگا ہوا ہے جی!''

''لوگ بھوک سے بھی مر رہے ہیں اور کھا کھا کے بھی۔ بیماری پھیلتی جا رہی ہے۔''

''پانچ دن پہلے ایک ٹرین گزری تھی یہاں۔ تل دھرنے کو بھی جگہ نہیں تھی، لوگ چھتوں پر لدے ہوئے تھے۔''

سویر سنکرانت کی تھی۔ گوردوارے میں دن رات پاٹھ چلتا رہتا تھا۔ بڑی شبھ گھڑی میں شانتی نے اپنے جڑواں بیٹوں کو جنم دیا۔ ایک تو بہت ہی کمزور پیدا ہوا۔ بچنے کی امید بھی نہیں تھی۔ لیکن شانتی نے ''نابھی'' (ناڑی) کے زور سے باندھے رکھا اسے۔

Scanned by CamScanner

اسی رات کسی نے کہہ دیا... "اسپیشل ٹرین آئی ہے۔ رفیوجیوں کو لینے، نکل چلو۔"

ایک بڑا سا ہجوم روانہ ہوگیا۔ گوردوارے سے۔ درشن سنگھ بھی! شاہنی کمزور تھی بہت۔ لیکن بیٹوں کے سہارے چلنے کو تیار ہوگئی۔ ماں نے ملنے سے انکار کردیا۔

"میں آجاؤں گی بیٹا۔ اگلے کسی قافلے کے ساتھ آجاؤں گی— تو بہو اور میرے پوتوں کو سنبھال کر نکل جا۔"

درشن سنگھ نے بہت ضد کی تو گرنتھی نے سمجھایا، سیواداروں نے ہمت دی۔ "نکل جاؤ سردار جی۔ ایک ایک کرکے سب بارڈر پار پہنچ جائیں گے۔ بی جی ہمارے ساتھ آجائیں گی۔"

درشن سنگھ نکل پڑا سب کے ساتھ۔ ڈھکن والی ایک بید کی ٹوکری میں ڈال کر بچوں کو سر پہ یوں اٹھالیا جیسے اپنے پریوار کا خوانچہ لے کر نکلا ہو۔

اسٹیشن پر گاڑی تو تھی لیکن گاڑی میں جگہ نہیں تھی۔ چھت پر لوگ گھاس کی طرح اگے ہوئے تھے۔ مگر بیچاری نئی نئی نحیف و نزار ماں اور نوزائیدہ بچوں کو دیکھ کر لوگوں نے چھت پر چڑھالیا اور جگہ دے دی۔

قریب دس گھنٹے بعد گاڑی میں ذرا سی حرکت ہوئی۔ شام بڑی سرخ تھی۔ لہولہان، تپا ہوا، تمتمایا ہوا چہرہ۔ شاہنی کی چھاتیاں نچڑ کر چھلکا ہوگئیں۔ ایک بچے کو رکھتی تو دوسرا اٹھالیتی۔ میلے کچیلے کپڑوں میں لپٹے دو بچوں کی پوٹلیاں۔ لگتا تھا کسی کوڑے کے ڈھیر سے اٹھا لائے ہیں... کچھ گھنٹوں بعد جب گاڑی رات میں داخل ہوئی تو درشن سنگھ نے دیکھا، ایک بچے کے ہاتھ پاؤں تو ہلتے دکھتے ہیں، کبھی کبھی رونے کی آواز بھی آتی ہے لیکن دوسرا بچہ ساکت تھا۔ پوٹلی میں ہاتھ ڈال کے دیکھا تو کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا!

درشن سنگھ جو پھوٹ پھوٹ کر رویا تو آس پاس کے لوگوں کو بھی معلوم ہوگیا۔ سب نے چاہا کہ شاہنی سے اس بچے کو لے لیں۔ لیکن وہ تو پہلے ہی پتھرا گئی تھی۔ ٹوکری کو چھاتی سے لگا کے بیٹھ گئی—

"نہیں۔ بھائی کے بغیر دوسرا دودھ نہیں پیتا۔" بہت کوشش کے باوجود شاہنی نے ٹوکری نہیں چھوڑی—

ٹرین دس بار رکی، دس بار چلی۔

لوگ اندھیرے میں اندازے ہی لگاتے رہے—

"بس جی... خیر آباد نکل گیا..."

"یہ تو گوجرانوالہ ہے جی..."

Scanned by CamScanner

''بس ایک گھنٹہ اور لاہور آیا کہ سمجھو پہنچ گئے۔ ہندوستان!...'' جوش میں لوگ نعرے بھی لگانے لگتے...

''ہر ہر مہادیو...''

''جو بولے سونہال...''

گاڑی ایک پل پر چڑھی تو لہر سی دوڑ گئی۔

''راوی آ گیا جی—''

''راوی ہے؟—لاہور آ گیا—!''

اس شور میں کسی نے درشن سنگھ کے کان میں پھسپھسا کر کہا... ''سردار جی— بچے کو یہیں پھینک دو راوی میں۔ اس کا کلیان ہو جائے گا۔ اس پار لے جا کر کیا کرو گے؟''

درشن سنگھ نے دھیرے سے ٹوکری دور کھسکالی اور پھر یکلخت ہی پوٹلی اٹھائی اور واہگورو کہہ کر راوی میں پھینک دی—

اندھیرے میں ہلکی سی آواز سنائی دی— کسی بچے کی۔

درشن سنگھ نے گھبرا کے دیکھا شاہنی کی طرف۔

مردہ بچہ شاہنی کی چھاتی سے لپٹا ہوا تھا—

پھر سے ایک شور کا بگولہ اٹھا—

''واگھا— واگھا—!''

Scanned by CamScanner

فصل

کئی گھنٹے اندھیرے کی لوئی اوڑھے وہ چھپا رہا۔ پلیا کے نیچے۔ پلیا کے نیچے بہتے پانی اور کیچڑ سے اس کی دھوتی بھیگ گئی تھی۔ پاؤں سن گئے تھے۔ جوتیاں اتار کر اس نے کمر سے باندھ لی تھیں۔ دور سے آتی فصلوں کی خوشبو اس کے نتھنوں کو چھوتی تو اس کی چھاتی میں طاقت بھر جاتی۔ وہ انہیں فصلوں کا جایا تھا۔ اس نے پیدا نہیں کیا ان فصلوں کو۔ ان فصلوں نے اسے پیدا کیا ہے۔ اس کے سب ساتھی کسانوں کو بھی۔

''ہم سب ان فصلوں کے بیٹے ہیں اور ان سٹوں میں بھرے دانے ہیں۔ لیکن ٹھاکر جب انہیں بھون کے اپنا پیٹ بھرتا ہے تو ہم سے برداشت نہیں ہوتا...''

اس کی اس بات پر کیسے گردن اونچی ہوگئی تھی کسانوں کی۔ اسے خود بھی لگا تھا کہ اس نے مزدوروں کے نیتا جیسی بات کردی تھی۔ جس کی تقریر وہ شہر میں سن کر آیا تھا۔ شہر میں اس کے بھائی نے اس سے ملوایا تھا۔

''اکیلے تم کچھ نہیں کرسکو گے۔ اکیلے اکیلے تو تمہیں زمیندار بھنے دانوں کی طرح چبا جائے گا۔ باقی تمام کسانوں کو بھی ساتھ لو۔ انہیں اپنے ساتھ ملاؤ اور اپنی زمین آزاد کراؤ۔ اس ملک میں زمینداری ختم ہوچکی ہے۔''

''لیکن میں کیسے سمجھاؤں گا انہیں؟ قانون کی بات تو آپ ہی سمجھا سکتے ہو۔''

''ضرورت پڑے گی تو لکھنا مجھے۔ میں آجاؤں گا۔ میں دورے پر نکلا تو تمہارے گاؤں سے ضرور گزروں گا۔''

اس کے بھائی نے بھی یقین دلایا تھا۔ اگر باپ نے زمین رہن نہ رکھی ہوتی تو اسے بھی کیا ضرورت تھی شہر میں جاکر مل مزدوری کرنے کی۔

''ہماری زمین پھر سے ہماری ہوجائے تو میں گاؤں واپس آجاؤں گا۔''

وہ گہرا حوصلہ لے کر آیا تھا شہر سے۔ بڑی بڑی باتیں کرنے لگا تھا۔ پارٹی کی، یونین کی، دو

Scanned by CamScanner

تین بار سب کسانوں کے سامنے اس کی پٹائی ہوئی تھی۔ اس کو الٹا لٹکا کر املی کی چھڑی سے پیٹا بھی گیا تھا۔ اس کے بیوی بچوں نے بھی سمجھایا تھا اسے۔ لیکن پتہ نہیں کیوں فتور چڑھ گیا تھا اس کے دماغ میں!

وہ اپنے گاؤں میں ہی نہیں، چپ چاپ پاس کے گاؤں میں جا کر بھی بھڑکانے لگا تھا کسانوں کو۔ کسان اس کی باتیں سنتے تو بڑے مزے لیتے تھے۔ اس کے سامنے بڑا جوش بھر جاتا ان میں۔ لیکن اس کے جاتے ہی پھر بھیگی بلی بن جاتے۔ ہندی کا اخبار اوپر کی جیب میں رکھنا اس کا اسٹائل ہو گیا۔ اس نے بتایا کسانوں کو کہ ہم اکیلے نہیں ہیں۔

''دیش میں ایک پارٹی بھی ہے جو ہمارے حقوق کے لیے لڑ رہی ہے۔''

پلیا کے نیچے بیٹھے بیٹھے جب اس کا دم گھٹنے لگتا تو وہ تھوڑی دیر کے لیے باہر آ جاتا۔ کھیتوں سے آتی ہوئی ہوا کو پھیپھڑوں میں بھر لیتا۔ بس ایک بار شہر پہنچ جائے۔ جاتے ہی پانڈے جی سے ملے گا۔ جس روز ساتھ کے گاؤں سے پٹ کر آیا تھا۔ اس روز اس نے اپنے بھائی کی معرفت چٹھی بھی بھیجی تھی پانڈے جی کو۔ لیکن کئی مہینے کوئی جواب نہ آیا اور جب بھائی کا جواب آیا تو بس اتنا ہی کہ پانڈے جی دورے پر گئے ہوئے ہیں۔ واپس آتے ہی چٹھی ان تک پہنچا دوں گا۔ اسے امید ہو گئی تھی اس دورے میں پانڈے جی ضرور اس گاؤں سے گزریں گے۔ اس کی ہمت بڑھ گئی تھی۔ اس نے سب مزدوروں کے کانوں میں پھونک دیا۔

''تیار رہنا جس دن پانڈے جی آئیں گے اس دن چوپال پر ایک میٹنگ بلائیں گے۔ پھر دیکھنا اس ٹھاکر ہرنام سنگھ کی کیا گت ہوتی ہے۔ پانڈے جی لاٹھی لٹھیت کی بات نہیں کرتے۔ قانون کی بات کرتے ہیں۔''

آپس میں سب مزدوروں کو معلوم تھا کہ کھلم کھلا کوئی اس میٹنگ میں نہیں جانے والا ہے۔ لیکن بات کرنے میں کیا ہے؟ پھس پھسا کر بات کرنے میں بھی تو ایک بجلی کی لہری دوڑ جاتی تھی ان ''رکت ہین'' (خون سے خالی) جسموں میں۔

پانڈے جی نے بہت دیر کر دی اور پتہ نہیں کس سالے نے چغلی کر دی ٹھاکر سے۔ اسے کھیتوں سے پکڑ کے اٹھا کے سامنے لایا گیا اور جب ٹھاکر کے سامنے اس نے اپنے نیتا کا نام لیا تو ٹھاکر نے اپنا تلے والا جوتا اتار کے منہ پر مارا...

''سالا کمیونسٹ! سیدھی طرح کام کر کھیتوں میں، نہیں تو جھونپڑی گرا کے ہل چلوا دوں گا۔ تیری میں...''

Scanned by CamScanner

اس کے باوجود اس کے دماغ سے فتور نہیں گیا۔ کمیونسٹ تو کمیونسٹ ہی سہی!!

جس دن لوکو کی بیٹی اٹھا کر لے گئے ٹھاکر کے بیٹے، اس دن لوکو نے آ کر سب کو دہائی دی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ حویلی تک چلنے کے لیے کوئی تیار نہ ہوا۔ لوکو نے اس کی طرف دیکھا تھا اور وہ ساتھ چل پڑا۔ ٹھاکر نے لوکو کو صرف اتنا ہی کہا...

''آنے دو لونڈوں کو میں ان کی خبر لیتا ہوں۔'' لیکن اس کو پھر دھر لیا ٹھاکر نے۔ ''کیوں بے؟ تو کیا باپ لگتا ہے سب کا؟ سالے ٹانگیں چیر کر رکھ دوں گا پھر کبھی تیری شکل دیکھی تو!''

اور ایسی لات ماری تھی کہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے جا پڑا۔ لوکو کندھے پر اٹھا کے لایا تھا اسے—

پر اتنا ہوا، اس کے بعد لوکو اور اس کے دو جوان بیٹوں نے کھیتوں پر کام کرنے سے انکار کر دیا اور بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اب وہ اکیلا نہیں تھا۔ تین آدمیوں کی ایک پارٹی بن چکی تھی۔

تیسرے دن لوکو کی بیٹی نے کنوئیں میں کود کر خودکشی کر لی۔ سارے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ ایسا کہرام پہلے بھی کئی بار مچا تھا۔ لیکن چوپال کے الاؤ کی طرح اپنے آپ ہی جل جل کر راکھ ہو جاتا تھا۔ اس بار الاؤ کے پاؤں لگ گئے۔ جلتی مشعلیں لئے پندرہ بیس آدمیوں کا ہجوم حویلی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ سب نے ''ٹھاکر ہرنام سنگھ مردہ باد'' اور ہائے ہائے کے نعرے لگائے۔ لیکن حویلی سے کسی نے جھانک کر بھی نہیں دیکھا۔ سب کو ڈر تھا کہ ٹھاکر بندوقیں لے کر برآمدے میں یا چھتوں پر آ کر کھڑے ہو جائیں گے۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔

صبح تک سب کے حوصلے بلند تھے۔ لیکن جب پولیس چھان بین کو آئی تو صرف اسی کو پکڑ کر لے گئی۔ بہت پیٹا گیا اسے لیکن اس نے کسی اور کا نام نہیں لیا۔ یہی کہتا رہا... ''سارا گاؤں تھا، پکڑ لو سب کو۔''

دس دن اسے اندر رکھا۔ دس دن میں آس پاس کے گاؤں میں بھی اس کی مشہوری ہو گئی۔

دس دن بعد گھر لوٹا تو پتہ چلا ٹھاکر کے لوگ اس کا گھر لوٹ لاٹ کر تباہ کر گئے اور رپٹ لکھوا دی کہ ڈاکو دان سنگھ کے آدمی آئے تھے۔ اس کے بیوی بچے تین دن تک ہری داس کے یہاں چھپے رہے اور وہیں سے نکل کر سیدھے شہر چلے گئے۔ اس کے بھائی کے پاس!

جس دن وہ چھوٹ کر آیا تھا اسی رات اس کے گھر کو آگ لگا دی گئی۔ چھپتا چھپاتا تین کوس پیدل چل کے وہ ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو ٹھاکر کے لٹھیت وہاں گھوم رہے تھے۔ ریل کی پٹری سے لگے نالے کے ساتھ ساتھ دوڑتا ہوا وہ اس پل کے نیچے آ کر چھپ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا آدھی رات

Scanned by CamScanner

کے بعد یہاں سے ایک مال گاڑی گزرتی ہے جو اس پل کے پاس آ کر آہستہ ہو جاتی ہے۔

گاڑی کی آواز سنتے ہی وہ بلیا سے باہر نکل آیا۔ دور ہی سے ایک ڈبے کا کھلا دروازہ دیکھ لیا اس نے اور پاس آتے ہی لٹک کے اوپر چڑھ گیا۔

مال گاڑی میں گھستے ہی ایک بندوق کی نالی اس کے سینے پر آ کر گڑ گئی۔

''کون ہے سالے؟ ڈبے میں کیوں چڑھا تو؟ جاسوس ہے کوئی؟''

''کیا کوئی پولیس کا کتا ہے...؟'' ایک اور آواز آئی۔

پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ کون تھے۔ یہ علاقہ ڈاکوؤں کی رہگزر تھا۔ سب جانتے تھے لیکن کبھی سامنا نہیں ہوا تھا۔

''غریب مسافر ہوں۔ بنا ٹکٹ سفر کر رہا ہوں۔ شہر جانا چاہتا ہوں۔''

ڈاکو نے بندوق ہٹالی اور ایک کونے میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ وہ اس ڈبے کا حکمراں تھا۔ دوسرے کونے میں بیٹھا اس کا ساتھی شراب پی رہا تھا۔ پیتل کے گلاس میں۔

پہلا ڈاکو پھر دروازے کے سامنے جا کر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کے سناٹے کے بعد اس نے پھر پوچھا... ''روٹی کھائے گا؟ شکل سے لگتا ہے کسی نے نچوڑ کے پھینک دیا ہے۔'' چپ سن کر اس نے پھر حکم دیا... ''ادھر جا۔ بیٹھ جا سردار کے پاس!''

کچھ ڈرتا گھبراتا وہ گھسٹ کے دوسرے کونے تک آ گیا۔ سیدھا کھڑا ہونے کی ہمت نہیں ہوئی۔ سردار نے ایک کپڑے کی پوٹلی آگے کر دی۔ روٹی کی مہک اپنے آپ ناک تک آ گئی۔

''کھول لے۔ آلو کے پراٹھے ہیں۔ اچار بھی ہے۔''

سردار کی آواز بڑی نرم تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے اس نے پوٹلی کی گرہ کھولی۔ پراٹھے ٹھنڈے تھے۔ پر تھے تازہ۔ اس نے ایک پراٹھا ہاتھ پر لے کر پوٹلی کو بند کرنا چاہا تو سردار پھر بولا...

''کھالے کھالے، اچار بھی لے لے''

بندوق والے ڈاکو نے آواز دی...

''نیچے پیاز رکھی ہے۔ چاہے تو لے لے۔''

جب کھانا شروع کر دیا اس نے تو ماحول کچھ نرم ہو گیا۔ سردار نے پوچھا...

''کہاں جا رہا ہے؟''

''چندروڑہ۔ وہاں سے لاری لے لوں گا۔''

''ہوں... وہ تو دن چڑھے آئے گا۔'' ایک چپ کے بعد پھر پوچھا... ''کہاں کا ہے؟ اس

Scanned by CamScanner

گاؤں کا؟ تجھر کہ؟"

کھاتے کھاتے ہی اس نے "ہاں" میں گردن ہلا دی۔ بندوق والے نے پوچھا... "دان سنگھ کا نام سنا ہے کبھی؟"

ایک ہچکی آ گئی اسے... "کون دان سنگھ؟ ڈاکو؟"

سردار نے پانی کی بوتل بڑھائی اور کہا... "ڈاکو نہیں، باغی دان سنگھ بول!"

"ہاں۔ وہی..." کہتے کہتے ہی وہ سمجھ گیا کہ کس کے سامنے بیٹھا ہے۔

"پچاس ہزار کا انعام ہے اس کے سر پر!" سردار کہہ رہا تھا...

"ہم بھی اسی گاؤں کے ہیں۔ اس ٹھاکر کے باپ نے ہماری بیٹی کو اٹھایا تھا۔"

ایک لمبی چپ سی رہی۔

"ہم نے بھی گھر میں گھس کے سالے کی کھوپڑی کلہاڑی سے کھول دی تھی۔ اپنی بیٹی کا بدلہ لے لیا تھا۔" اس نے زور سے تھوکا ایک طرف۔ "اب اس کے بیٹے بھی وہی کر رہے ہیں اور کوئی دانی رام سنا ہے بدلہ لے گا اس سے۔ پارٹی بنا رہا ہے!" پھر زور سے تھوکا اس نے!

"حرام زادہ۔ سمجھتا ہے نعرے لگا کے مارے گا اسے... بزدل سالا۔ ماں کا خصم۔ ہاتھ اٹھانے کا دم نہیں۔ قانون بدلے گا۔"

گاڑی آہستہ آہستہ ہو رہی تھی۔ سردار کھڑا ہو گیا۔ کمر پر کارتوسوں کی پیٹی سیدھی کی اور بندوق والے سے بولا... "بڑا نالا آ رہا ہے۔ تیار ہو جا۔"

دونوں کود جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ جاتے جاتے سردار نے کہا...

"جو کھا کے بچے پوٹلی میں، پھینک دینا اور خبردار کسی پولیس والے کو خبر کی تو۔"

دانی رام پہلی بار کھڑا ہوا—

"فکر نہیں کرو سردار۔ تم بھی میرے گاؤں کے ہو۔ میں بھی اسی فصل کی پیداوار ہوں جس فصل سے تم پیدا ہوئے ہو۔"

دیکھتے ہی دیکھتے دونوں اندھیرے میں کود گئے اور دانی رام کھڑا دیکھتا رہا اندھیر کی طرف!

Scanned by CamScanner

دھواں

بات سلگی تو بہت دھیرے سے تھی۔ لیکن دیکھتے دیکھتے پورے قصبے میں دھواں بھر گیا۔

چودھری کی موت صبح چار بجے ہوئی تھی۔ سات بجے تک چودھرائن نے رو دھو کر ہوش سنبھالے اور سب سے پہلے ملا خیرالدین کو بلایا اور نوکر کو سخت تاکید کی کہ کوئی ذکر نہ کرے۔ نوکر جب ملا کو آنگن میں چھوڑ کر چلا گیا تو چودھرائن ملا کو اوپر خواب گاہ میں لے گئی۔ جہاں چودھری کی لاش بستر سے اتار کر زمین پر لٹا دی گئی تھی۔ دو سفید چادروں کے بیچ لپٹا ایک زردی مائل سفید چہرہ، سفید بھنویں، داڑھی اور لمبے سفید بال۔ چودھری کا چہرہ بڑا نورانی لگ رہا تھا۔

ملا نے دیکھتے ہی "انا للہ وانا الیہ راجعون" پڑھا۔ کچھ رسمی سے جملے کہے۔ ابھی ٹھیک سے بیٹھا بھی نہ تھا کہ چودھرائن الماری سے وصیت نامہ نکال لائی۔ ملا کو دکھایا اور پڑھایا بھی۔ چودھری کی آخری خواہش تھی کہ انہیں دفن کرنے کے بجائے چتا پر رکھ کر جلایا جائے اور ان کی راکھ کو گاؤں کی ندی میں بہا دیا جائے جو ان کی زمین سینچتی ہے۔

ملا پڑھ کے چپ ہو رہا۔ چودھری نے دین مذہب کے لیے بڑے کام کیے تھے گاؤں میں۔ ہندو مسلمان کو یکساں دان دیتے تھے۔ گاؤں کی ادھ کچی مسجد پکی کروا دی تھی اور تو اور ہندوؤں کی شمشان کی عمارت بھی پکی کروائی تھی۔ اب کئی برسوں سے بیمار پڑے تھے۔ لیکن اس بیماری کے دوران بھی ہر رمضان میں غریب غرباء کی افطاری کا انتظام انہی کی طرف سے ہوا کرتا تھا۔ علاقے کے مسلمان بڑے بھگت تھے ان کے۔ بڑا عقیدہ تھا ان پر اور اب وصیت پڑھ کر حیرت ہوئی ملا کو۔ کہیں کوئی جھمیلا نہ کھڑا ہو جائے۔ آج کل ملک میں ویسے ہی فضا خراب ہو رہی تھی۔ ہندو کچھ زیادہ ہی ہندو ہو گئے تھے۔ مسلمان کچھ زیادہ مسلمان!

چودھرائن نے کہا "میں کوئی پاٹھ پوجا نہیں کروانا چاہتی۔ بس اتنا چاہتی ہوں کہ شمشان میں انہیں جلانے کا انتظام کرا دیجئے۔ میں رامچند رپنڈت کو بھی بتا سکتی تھی۔ لیکن اس لیے نہیں بلایا کہ بات کہیں بگڑ نہ جائے۔"

Scanned by CamScanner

بات دبانے ہی سے بگڑ گئی۔ جب ملا خیرالدین نے مصلحتاً پنڈت رامچند ر کو بلا کر سمجھایا کہ...

''تم چودھری کو اپنے شمشان میں جلانے کی اجازت نہ دینا۔ ہوسکتا ہے علاقے کے مسلمان جھمیلا کھڑا کردیں۔ آخر چودھری کوئی عام آدمی تو تھا نہیں۔ بہت سے لوگ بہت طرح سے ان سے جڑے ہوئے ہیں۔''

پنڈت رامچند ر نے بھی یقین دلایا کہ وہ کسی طرح کی شرانگیزی اپنے علاقے میں نہیں چاہتے۔ اس سے پہلے کہ بات پھیلے وہ بھی اپنی طرف کے مخصوص لوگوں کو سمجھا دیں گے۔

بات جو سلگ گئی تھی، دھیرے دھیرے آگ پکڑنے لگی۔

''سوال چودھری اور چودھرائن کا نہیں ہے۔ سوال عقیدوں کا ہے۔ سوال ساری قوم، کمیونٹی اور مذہب کا ہے۔ چودھرائن کی ہمت کیسے ہوئی کہ وہ اپنے شوہر کو دفن کرنے کے بجائے جلانے پر تیار ہوگئی۔ وہ کیا اسلام کے آئین نہیں جانتی؟''

کچھ لوگوں نے چودھرائن سے ملنے کی ضد کی۔ چودھرائن نے بڑی دھیرج سے کہا... ''بھائیو ایسی ان کی آخری خواہش تھی۔ مٹی ہی تو ہے۔ اب جلا دو یا دفن کردو۔ جلانے سے ان کی روح کو تسکین ملے تو آپ کو کیا اعتراض ہوسکتا ہے؟''

ایک صاحب کچھ زیادہ طیش میں آگئے۔ بولے... ''انہیں جلا کر کیا آپ کو تسکین ہوگی؟''

''جی ہاں'' چودھرائن کا جواب بہت مختصر تھا۔ ''ان کی آخری خواہش پوری کرنے سے ہی مجھے تسکین ہوگی۔''

دن چڑھتے چڑھتے چودھرائن کی بے چینی بڑھنے لگی۔ جس بات کو وہ صلح صفائی سے نپٹانا چاہتی تھیں وہ طول پکڑنے لگی۔ چودھری صاحب کی اس خواہش کے پیچھے کوئی پیچیدہ پلاٹ، کہانی یا راز کی بات نہیں تھی۔ نہ ہی کوئی ایسا فلسفہ تھا جو کسی دین، مذہب یا عقیدے سے جڑتا ہو۔ ایک سیدھی سادی انسانی خواہش تھی کہ مرنے کے بعد میرا کوئی نام ونشان نہ رہے۔

''جب ہوں تو ہوں۔ جب نہیں ہوں تو کہیں نہیں ہوں۔''

برسوں پہلے یہ بات بیوی سے ہوئی تھی۔ پر جیتے جی کہاں کوئی ایسی تفصیل میں جھانک کر دیکھتا ہے اور یہ بات وہ اپنے وصیت نامے میں لکھ گئے تھے۔ اب مرنے کے بعد اس خواہش کو پورا کرنا چودھرائن کی محبت اور بھروسے کا ثبوت تھا۔ یہ کیا کہ آدمی آنکھ سے اوجھل ہوا، اور آپ تمام عہد و پیمان بھول گئے۔

چودھرائن نے ایک بار بیرو کو بھیج کر رامچند ر پنڈت کو بلانے کی کوشش بھی کی۔ لیکن پنڈت ملا

Scanned by CamScanner

ہی نہیں۔ اس کے جوڑی دار نے کہا... ''دیکھو بھائی ہم جلانے سے پہلے منتر پڑھ کر چودھری کو تلک ضرور لگائیں گے۔''

''ارے بھائی جو مر چکا اس کا دھرم اب کیسے بدلے گا؟''

''تم زیادہ بحث تو کرو نہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ گیتا کے شلوک پڑھے بغیر ہم کسی کو مکھ اگنی دیں۔ ایسا نہ کریں تو آتما کو مکتی نہیں ملتی۔ مکتی نہیں ملی تو وہ بے چین آتما ہم سب کو ستائے گی۔ تمہیں بھی، ہمیں بھی۔ چودھری صاحب کے ہم پر بہت احسان ہیں۔ ہم ان کی آتما کے ساتھ ایسا نہیں کر سکتے۔''

بیر لوٹ گیا۔

بیرو جب پنڈت کے گھر سے نکل رہا تھا تو پنا نے دیکھ لیا۔ پنا نے جا کر مسجد میں خبر کر دی۔

آگ جو گھٹ گھٹ کر ٹھنڈی ہونے لگی تھی پھر سے بھڑک اٹھی۔ چار پانچ معتبر مسلمانوں نے تو اپنا قطعی فیصلہ بھی سنا دیا۔ ان پر چودھری کے بہت احسان تھے۔ وہ ان کی روح کو بھٹکنے نہیں دیں گے۔ مسجد کے پچھواڑے والے قبرستان میں قبر کھودنے کا حکم بھی دے دیا۔

شام ہوتے ہوتے کچھ لوگ پھر حویلی پر آ دھمکے۔ انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ چودھرائن کو ڈرا دھمکا کر چودھری کا وصیت نامہ اس سے حاصل کر لیا جائے اور جلا دیا جائے۔ پھر جب وصیت نامہ ہی نہیں رہے گا تو بڑھیا کیا کر لے گی۔

چودھرائن نے یہ بات شاید سونگھ لی تھی۔ وصیت نامہ تو اس نے کہیں چھپا دیا تھا اور جب لوگوں نے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی تو اس نے کہہ دیا... ''ملا خیر الدین سے پوچھ لو۔ اس نے وصیت دیکھی ہے اور پوری پڑھی ہے۔''

''اور اگر وہ انکار کر دے تو؟''

''قرآن شریف پر ہاتھ رکھ کر انکار کر دے تو دکھا دوں گی۔ ورنہ...''

''ورنہ کیا؟''

''ورنہ کچہری میں دیکھنا۔''

بات کچہری تک جا سکتی ہے۔ یہ بھی واضح ہو گیا۔ ہو سکتا ہے چودھرائن شہر سے اپنے وکیل کو اور پولیس کو بلا لے۔ پولیس کو بلا کر ان کی حاضری میں اپنے ارادے پر عمل کر لے اور کیا پتہ وہ اب تک انہیں بلا بھی چکی ہو۔ ورنہ شوہر کی لاش برف کی سلوں پر رکھ کر کوئی کیسے اتنی خود اعتمادی سے بات کر سکتا ہے—

Scanned by CamScanner

رات کے وقت تک خبریں افواہوں کی رفتار سے اڑتی ہیں۔ کسی نے کہا...

''ایک گھوڑسوار ابھی ابھی شہر کی طرف جاتے ہوئے دیکھا گیا ہے۔ گھوڑسوار نے سر اور منہ صافے سے ڈھانپ رکھا تھا اور وہ چودھری کی حویلی کی طرف سے ہی آرہا تھا۔''

ایک نے تو اسے چودھری کے اصطبل سے نکلتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔

خادو کا کہنا تھا کہ اس نے حویلی کے پچھلے احاطے میں صرف لکڑیاں کاٹنے کی آواز ہی نہیں سنی بلکہ پیڑ گرتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔

چودھرائن یقیناً پچھلے احاطے میں چتا لگوانے کا انتظام کررہی ہے۔ کلو کا خون کھول اٹھا۔

''بزدلو... آج رات ایک مسلمان کو چتا پر جلایا جائے گا اور تم سب یہاں بیٹھے آگ کی لپٹیں دیکھو گے؟''

کلو اپنے اڈے سے باہر نکلا۔ خون خرابہ اس کا پیشہ ہے تو کیا ہوا۔ ایمان بھی تو کوئی چیز ہے۔

''ایمان سے عزیز تو ماں بھی نہیں ہوتی یارو۔''

چار پانچ ساتھیوں کو لے کر کلو پچھلی دیوار سے حویلی پر چڑھ گیا۔ بڑھیا اکیلی بیٹھی تھی لاش کے پاس۔ چونکنے سے پہلے ہی کلو کی کلہاڑی سر سے گزر گئی۔

چودھری کی لاش کو اٹھوایا اور مسجد کے پچھواڑے لے گئے جہاں اس کی قبر تیار تھی۔ جاتے جاتے رمضے نے پوچھا...

''صبح چودھرائن کی لاش ملے گی تو کیا ہوگا؟''

''بڑھیا مرگئی کیا؟''

''سر پھٹ گیا تھا۔ صبح تک بچے گی کیا؟''

کلو رکا اور دیکھا چودھرائن کی خواب گاہ کی طرف۔ پتا کلو کے 'جگرے' کی بات سمجھ گیا۔

''تو چل استاد۔ تیرا 'جگر' کیا سوچ رہا ہے۔ میں جانتا ہوں سب انتظام ہوجائے گا۔''

کلو نکل گیا قبرستان کی طرف۔

رات جب چودھری کی خواب گاہ سے آسمان چھوتی لپٹیں نکل رہی تھیں تو قصبہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔

زندہ جلا دیئے گئے تھے۔

اور مردہ دفن ہوچکے تھے۔

Scanned by CamScanner

تقسیم

زندگی کبھی کبھی زخمی چیتے کی طرح جست لگاتی دوڑتی ہے اور جگہ جگہ اپنے پنجوں کے نشان چھوڑتی جاتی ہے! ذرا ان نشانوں کو لکیر سے جوڑ کے دیکھیے تو کیسی عجیب تحریر بنتی ہے۔

چوراسی پچاسی (84-85) کی بات ہے جب کوئی ایک صاحب امرتسر سے اکثر خط لکھا کرتے تھے کہ میں ان کا ''تقسیم'' میں کھویا ہوا بھائی ہوں۔ اقبال سنگھ نام تھا ان کا اور غالباً خالصہ کالج میں پروفیسر تھے۔ دو چار خط آنے کے بعد میں نے انہیں مفصل جواب بھی دیا کہ میں تقسیم کے دوران دہلی میں تھا اور اپنے والدین کے ساتھ ہی تھا اور میرا کوئی بھائی یا بہن ان فسادات میں گم نہیں ہوا تھا۔ لیکن اقبال سنگھ اس کے باوجود اس بات پر بضد رہے کہ میں ان کا گمشدہ بھائی ہوں اور شاید اپنے بچپن کے واقعات سے ناواقف ہوں یا بھول چکا ہوں۔ ان کا خیال تھا کہ میں بہت چھوٹا تھا جب ایک قافلے کے ساتھ سفر کرتے ہوئے گم ہو گیا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ جو لوگ مجھے بچا کر اپنے ساتھ لے آئے تھے ان لوگوں نے بتایا نہیں مجھے، یا میں ان کا اتنا احسان مند ہوں کہ اب کوئی صورت حال مان لینے کے لیے تیار نہیں۔ میں نے یہ بھی بتایا تھا انہیں کہ ۱۹۴۷ء میں میں اتنا کم عمر بھی نہیں تھا۔ قریب گیارہ برس کی عمر تھی میری۔ لیکن اقبال سنگھ کسی صورت ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں نے جواب دینا بند کر دیا۔ کچھ عرصے بعد خط آنے بھی بند ہو گئے۔

قریب ایک سال گزرا ہوگا کہ بمبئی کی ایک فلم کار، سائی پرانجپے، کا ایک پیغام ملا... کوئی ہربھجن سنگھ ہیں دہلی میں، مجھ سے بمبئی آ کر ملنا چاہتے ہیں۔ وجہ ملاقات سائی نے نہیں بتائی۔ لیکن کچھ پراسرار سوال پوچھے جن کی میں ان سے توقع نہیں کرتا تھا۔ پوچھنے لگیں...

''تقسیم کے دنوں میں تم کہاں تھے؟''

''دہلی میں!'' میں نے بتایا! ''کیوں؟''

''یوں ہی!''

سائی بہت خوبصورت اردو بولتی ہیں۔ لیکن آگے انگریزی میں پوچھا۔

Scanned by CamScanner

''اور والدین تمہارے؟''

''دہلی میں تھے۔ میں ساتھ ہی تھا ان کے۔ کیوں؟''

تھوڑی دیر بات کرتی رہیں۔ لیکن مجھے لگ رہا تھا جیسے انگریزی کا پردہ ڈال رہی ہیں بات پر، کیونکہ مجھ سے ہمیشہ اردو میں بات کرتی تھیں جسے وہ ہندی کہتی ہیں۔ بالآخر پھوٹ ہی پڑیں۔

''دیکھو گزاریوں ہے کہ آئی ایم ناٹ سپوز ٹو ٹیل یو... لیکن دہلی میں کوئی صاحب ہیں جو کہتے ہیں کہ تم تقسیم میں کھوئے ہوئے ان کے بیٹے ہو!''

یہ ایک نئی کہانی تھی۔

قریب ایک ماہ بعد امول پالیکر بمبئی کے مشہور اداکار کا فون آیا۔ کہنے لگے...

''مسز ڈنڈوتے تم سے بات کرنا چاہتی ہے۔ دہلی میں۔''

''مسز ڈنڈوتے کون؟''... میں نے پوچھا۔

''ایکس فائنس منسٹر آف جنتا گورمنٹ، مسٹر مدھو ڈنڈوتے کی پتنی۔''

''وہ کیوں؟''

''پتہ نہیں۔ لیکن وہ کس وقت تمہیں کہاں فون کر سکتی ہیں؟''

میرا کوئی سروکار نہیں تھا مسٹر یا مسز مدھو ڈنڈوتے کے ساتھ۔ کبھی ملا بھی نہیں تھا۔ مجھے حیرت ہوئی۔ امول پالیکر کو میں نے دفتر اور گھر کے اوقات بتا دیئے۔

افسانہ بل کھا رہا تھا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ بھی اسی سائی والے افسانے کی کڑی ہے۔ لیکن امول پالیکر کیونکہ اداکار ہے، اچھی اداکاری کر گیا اور مجھے اس کی وجہ نہیں بتائی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اس وقت بھی وجہ ضرور جانتا ہوگا۔

کچھ روز بعد پرملا ڈنڈوتے کا فون آیا۔ انہوں نے بتایا کہ دہلی سے ایک سردار ہربھجن سنگھ بمبئی آکر مجھ سے ملنا چاہتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے میں تقسیم میں کھویا ہوا ان کا بیٹا ہوں۔ وہ نومبر کا مہینہ تھا اتنا یاد ہے... میں نے ان سے کہا میں جنوری میں دہلی آرہا ہوں۔ انٹرنیشنل فلم اتسو میں۔ دس جنوری کو میں دہلی ہوں گا۔ تب ہی مل لوں گا۔ انہیں یہاں مت بھیجئے۔ میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ سردار ہربھجن سنگھ کون ہے؟ انہوں نے بتایا جنتا راج کے دوران وہ پنجاب میں سول سپلائی منسٹر تھے۔ جنوری میں دہلی گیا۔ اشوک ہوٹل میں ٹھہرا تھا۔ ہربھجن سنگھ صاحب کے یہاں سے فون آیا کہ وہ کب مل سکتے ہیں۔ تب تک مجھے یہ اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ کوئی بہت معتبر بزرگ انسان ہیں۔ بات کرنے والے ان کے بیٹے تھے۔ احتراماً عرض کیا:

Scanned by CamScanner

''آپ انہیں زحمت نہ دیں۔ کل دوپہر کے وقت آپ تشریف لائیں۔ میں آپ کے ساتھ چل کر ان کے دولت خانے پر مل لوں گا۔''

حیرت ہوئی یہ جان کر کہ سائی بھی وہاں تھی، امول پالیکر بھی وہاں تھے اور میرے اگلے روز کی اس اپوائنٹمنٹ کے بارے میں وہ دونوں جانتے تھے۔ اگلے روز دوپہر کو جو صاحب مجھے لینے آئے وہ ان کے بڑے بیٹے تھے۔ ان کا نام اقبال سنگھ تھا۔ پنجابیوں کی عمر ہو جاتی ہے لیکن بوڑھے نہیں ہوتے۔ اٹھ کر بڑے پیار سے ملے۔ میں نے بیٹوں کی طرح ہی ''پیری پونا'' کیا۔ انہوں نے ماں سے ملایا۔

''یہ تمہاری ماں ہے بیٹے۔''

ماں کو بھی ''پیری پونا'' کیا۔ بیٹے انہیں دار جی کہہ کے بلاتے تھے۔ دوسرے بیٹے، بہوئیں، بچے اچھا خاصہ ایک پریوار تھا۔ کافی کھلا بڑا گھر! یہ کھلا پن بھی پنجابیوں کے رہن سہن میں ہی نہیں، ان کے مزاج میں بھی شامل ہے۔ تمام علیک سلیک کے بعد کچھ کھانے کو بھی آ گیا پینے کو بھی آ گیا اور دار جی نے بتایا کہ مجھے کہاں کھویا تھا۔

''بڑے سخت دنگے ہوئے جی۔ ہر طرف آگ ہی آگ تھی اور آگ میں جھلسی ہوئی خبریں، پر ہم بھی ٹکے ہی رہے۔ زمین دار مسلمان تھا اور ہمارے پا جی کا دوست تھا اور بڑا مہربان تھا ہم پر اور سارا قصبہ جانتا تھا کہ اس کے ہوتے ہوئے کوئی بے وقت ہمارے دروازے پر دستک بھی نہیں دے سکتا تھا۔ اس کا بیٹا اسکول میں میرے ساتھ پڑھتا تھا (شاید ایاز نام لیا تھا) لیکن جب پیچھے سے آنے والے قافلے ہمارے قصبے سے گزرتے تھے تو دل دہل جاتا تھا۔ اندر ہی اندر کانپ جاتے تھے ہم۔ زمین دار روز صبح اور شام کو آ کر مل کے جاتا تھا۔ حوصلہ دے کر جاتا تھا۔ میری پتنی کو بیٹی بنا رکھا تھا اس نے۔ ایک روز دہائیاں دیتا ایسا ایک قافلہ گزرا کہ ساری رات چھت کی منڈیر پر کھڑے گزری۔ ہمیں نہیں، سارا قصبہ جاگ رہا تھا۔ لگتا تھا وہی آخری رات ہے صبح پرلے (قیامت) آنے والی ہے۔ ہمارے پاؤں اکھڑ گئے۔ پتہ نہیں کیوں لگا کہ یہی آخری قافلہ ہے۔ اب نکل لو۔ اس کے بعد کچھ نہیں بچے گا۔ اپنے محسن اپنے زمین دار سے سلام دعا کر کے نکل آئے۔ وہ روز کہا کرتا تھا۔

''میری حویلی پر چلو میرے ساتھ رہو۔ کچھ دن کے لیے تالا مارو گھر کو۔ کوئی نہیں چھوئے گا۔''

لیکن ہم جھوٹ موٹ کا حوصلہ دکھاتے رہے۔ اندر ہی اندر ڈرتے تھے۔ سچ بتاؤں سپورن کا کا، ایمان ہل گئے تھے۔ جڑیں کانپنے لگی تھیں۔ سارے قافلے اسی راستے سے گزر رہے تھے۔ سنا تھا میانوالی سے ہو کے جموں میں داخل ہو جاؤ تو آگے نیچے تک جانے کے لیے فوج کی کمک مل

Scanned by CamScanner

جائے گی۔ گھر ویسے کے ویسے ہی کھلے چھوڑ آئے۔ سچ تو یہ ہے کہ دل نے بانگ دے دی تھی۔ اب وطن کی مٹی چھوڑنے کا وقت آ گیا۔ کوچ کر چلو۔ دو لڑکے بڑے، ایک چھوٹی بیٹی آٹھ نو برس کی اور سب سے چھوٹے تم! دو دن کا سفر تھا۔ میانوالی تک پیدل۔ کھانے کو، جس گاؤں سے گزرتے کچھ مل جاتا تھا۔ دنگے سب جگہ ہوئے تھے۔ ہو بھی رہے تھے۔ لیکن دنگے والوں کے لشکر ہمیشہ باہر ہی سے آتے تھے۔ میانوالی تک پہنچتے پہنچتے قافلہ بہت بڑا ہو گیا۔ کئی طرف سے لوگ آ آ کر جڑتے جاتے تھے۔ بڑی ڈھارس ہوتی تھی بیٹا، اپنے جیسے دوسرے بدحال کو دیکھ کر۔ میانوالی ہم رات کو پہنچے۔ اسی بیچ کئی بار بچوں کے ہاتھ چھٹے ہم سے، بدحواس ہو کر پکارنے لگتے تھے اور بھی تھے ہم جیسے، اور کہرام سا مچا رہتا تھا۔

''پتہ نہیں کیسے یہ خبر پھیل گئی کہ اس رات میانوالی پر حملہ ہونے والا ہے۔ مسلمانوں کا لشکر آ رہا ہے۔ خوف اور ڈر کا ایسا سناٹا کبھی نہیں سنا۔ رات کی رات ہی سب چل پڑے۔''

دار جی کچھ دیر کو چپ ہو گئے۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں۔ لیکن ماں چپ چاپ ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہی تھی۔ کوئی اموشن نہیں تھا اس کے چہرے پر۔ دار جی بڑے دھیرے سے بولے... ''بس اسی رات اس کوچ میں چھوٹے دونوں بچے ہم سے چھوٹ گئے۔ پتہ نہیں کیسے؟ پتہ ہو تو...''

وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر چپ ہو گئے۔ مجھے بہت تفصیل سے یاد نہیں۔ بیٹے، بہویں کچھ انھیں، کچھ جگہ بدل کے بیٹھ گئے۔ دار جی نے بتایا۔

''جموں پہنچ کر بہت عرصہ انتظار کیا! ایک ایک کیمپ جا کر ڈھونڈتے تھے اور آنے والے قافلوں کو دیکھتے تھے۔ بے شمار لوگ تھے۔ قافلوں کی شکل میں ہی کچھ پنجاب کی طرف چلے گئے، کچھ نیچے اتر گئے جہاں جہاں جس کسی کے رشتے دار تھے۔ جب مایوس ہو گئے ہم تو پنجاب آ گئے۔ وہاں کے کیمپ دیکھتے رہے۔ بس ایک تلاش ہی رہ گئی۔ بچے گم ہو چکے تھے، امید چھٹ چکی تھی۔''

''کوئی بیس بائیس سال بعد ایک جتھا ہندوستان سے جا رہا تھا۔ گرودوارہ پنجہ صاحب کی یاترا کرنے۔ بس جی کر آیا جانے کے لیے۔ اپنا گھر دیکھنے کا بھی کئی بار خیال آیا تھا لیکن یہ بھلی مانس ہمیشہ اس خیال سے ہی ٹوٹ کے نڈھال ہو جاتی تھی۔'' انہوں نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''اور پھر یہ گلٹ (Guilt) بھی ہم سے چھٹا نہیں کہ ہم نے اپنے قصبے کے زمین دار کا اعتبار نہیں کیا، سوچ کر ایک شرمندگی کا احساس ہوتا تھا۔''

Scanned by CamScanner

بہر حال ہم نے جانے کا فیصلہ کرلیا اور جانے سے پہلے میں نے ایک خط لکھا۔ زمین دار کے نام اور ان کے بیٹے ایاز کے نام بھی۔ اپنے کیے کی معافی بھی مانگی۔ اپنے ہجرت کے حالات بھی بتائے، پریوار کے بھی اور دونوں گم شدہ بچوں کا ذکر بھی کیا۔ ستیہ اور سمپورن کا۔ خیال تھا شاید ایاز تو نہ پہچان سکے لیکن زمین دار افضل ہمیں نہیں بھول سکتا۔ خط میں نے پوسٹ نہیں کیا۔ سوچا وہیں جا کے کروں گا۔ بیس پچیس دن کا دورہ ہے۔ اگر ملنا چاہے گا تو چاچا افضل ضرور جواب دے گا۔ بلوایا تو جائیں گے ورنہ... اب کیا فائدہ قبریں کھول کے؟ کیا ملنا ہے؟

ایک لمبی سانس لے کر ہر بھجن سنگھ جی بولے!

''وہ خط میری جیب ہی میں پڑا رہا پنچی جی۔ میں مانا ہی نہیں۔ واپسی میں کراچی سے ہو کر آیا اور جس دن لوٹ رہا تھا، پتہ نہیں کیا سوجھی، میں نے ڈاک میں ڈال دیا۔''

''نہ چاہتے ہوئے بھی ایک انتظار رہا۔ لیکن کچھ ماہ گزر گئے تو وہ بھی ختم ہو گیا۔ آٹھ سال کے بعد مجھے جواب آیا۔''

''افضل چاچا کا؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔ وہ چپ رہے۔ میں نے پھر پوچھا ''ایاز کا؟'' سر کو ہلکی سی جنبش دے کر بولے ''ہاں! اسی خط کا جواب تھا۔'' خط سے پتہ چلا کہ تقسیم کے کچھ سال بعد ہی افضل چاچا کا انتقال ہو گیا تھا۔ ساری زمین داری ایاز ہی سنبھالا کرتا تھا۔ چند روز پہلے ہی ایاز کا انتقال ہوا تھا۔ اس کے کاغذ پتر دیکھے جا رہے تھے تو کسی ایک قمیض کی جیب سے وہ خط نکلا۔ ماتم پرسی کے لیے آئے لوگوں میں کسی نے وہ خط پڑھ کر سنایا، تو ایک شخص نے اطلاع دی کہ جس گمشدہ لڑکی کا ذکر ہے اس خط میں، وہ ایاز کے انتقال پر ماتم پرسی کرنے آئی ہوئی ہے۔ میانوالی سے۔ اسے بلا کر پوچھا گیا تو اس نے بتایا کہ اس کا اصلی نام ستیہ ہے۔ وہ تقسیم میں اپنے ماں باپ سے بچھڑ گئی تھی اور اب اس کا نام دلشاد ہے۔''

ماں کی آنکھیں اب بھی خشک تھیں۔ لیکن دار جی کی آواز پھر سے رندھ گئی تھی۔

''واگھورو کا نام لیا اور اسی روز روانہ ہو گئے۔ دلشاد وہیں ملی، افضل چاچا کے گھر۔ لو جی اسے سب یاد تھا۔ پر اپنا گھر یاد نہیں۔ ہم نے پوچھا وہ کھوئی کیسے؟ بچھڑی کیسے ہم سے؟ تو بولی ''میں چل چل کے تھک گئی تھی۔ مجھے بہت نیند آ رہی تھی۔ میں ایک گھر کے آنگن میں تندور لگا تھا، اس میں جا کر سو گئی تھی۔ جب اٹھی تھی تو کوئی بھی نہیں تھا۔ سارا دن ڈھونڈ کے وہیں جا کے سو جاتی تھی۔ تین دن بعد وہ گھر والے آئے تو انہوں نے جگایا مجھے۔ میاں بیوی تھے۔ پھر وہیں رکھ لیا کہ شاید کوئی ڈھونڈتا ہوا آ جائے۔ پر کوئی آیا ہی نہیں۔ انہی کے گھر نوکرانی سی ہو گئی۔ کھانا کپڑا ملتا رہا۔ پر بہت

Scanned by CamScanner

اچھی طرح رکھا اس نے۔ پھر بہت سال بعد، شاید آٹھ نو سال بعد مالک نے مجھ سے اپنا نکاح پڑھ کے اپنی بیگم بنالیا۔ اللہ کے فضل سے دو بیٹے ہیں۔ ایک پاکستان ایئرفورس میں ہے، دوسرا کراچی میں اچھے عہدے پر نوکری کر رہا ہے۔"

رائٹرز کو کچھ کلیشے قسم کے سوالات کرنے کی عادت ہوتی ہے، جس کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے پوچھا...

"وہ حیران نہیں ہوئی آپ کو دیکھ کر؟ یا مل کر؟ روئی نہیں؟"

"نہیں حیران تو ہوئی۔ لیکن ایسی کوئی خاص متاثر نہیں ہوئی۔"— دار جی نے کہا۔

"اور سمپورن؟ اس کے ساتھ نہیں تھا؟"

"نہیں اسے تو یاد بھی نہیں تھا۔"

ماں نے پھر وہی کہا جو ان باتوں کے درمیان دو تین بار کہہ چکی تھی۔

"پنی (سمپورن) تو مان کیوں نہیں جاتا۔ کیوں چھپاتا ہے ہم سے! اپنا نام بھی چھپا رکھا ہے تو نے۔ جیسے ستیہ دلشاد ہوگئی، تجھے بھی کسی نے گلزار بنا دیا ہوگا۔" تھوڑے سے وقفے کے بعد پھر بولی—

"گلزار کس نے نام دیا تجھے؟ تیرا نام سمپورن سنگھ ہے!"

میں نے دار جی سے پوچھا...

"میری خبر کیسے ملی آپ کو؟ یا کیسے خیال آیا میں آپ کا بیٹا ہوں؟"

"ایسا ہے پتر— واگورو کی کرنی تیس پینتیس سال بعد ہی مل گئی۔ تو امید بندھ گئی شاید واگورو بیٹے سے بھی ملوا دے۔ اقبال نے ایک دن تمہارا انٹرویو پڑھا کسی پرچے میں اور بتایا تمہارا اصلی نام سمپورن سنگھ ہے اور تمہاری پیدائش بھی اسی طرف کی ہے۔ پاکستان کی۔ تو اس نے تلاش شروع کر دی۔ ہاں میں نے یہ نہیں بتایا تمہیں کہ اس کا نام اقبال، افضل چاچا کا دیا ہوا ہے۔"

ماں نے کہا... "کاکا تو جہاں مرضی ہے رہ! تو مسلمان ہو گیا ہے تو کوئی بات نہیں۔ پر مان تو لے تو ہی میرا بیٹا ہے، پنی۔"

میں اپنے خاندان کی ساری تفصیل دے کر ایک بار پھر ہربھجن سنگھ جی کو ناامید کر کے لوٹ آیا۔

اس بات کو بھی سات آٹھ سال ہو گئے۔ اب سن ۱۹۹۳ء ہے!

اتنے برسوں بعد اقبال کی چٹھی ملی اور بھوگ کا کارڈ ملا کہ سردار ہربھجن سنگھ جی پرلوک سدھار گئے۔ ماں نے کہلوایا ہے کہ چھوٹے کو ضرور خبر دینا۔ مجھے لگا جیسے سچ مچ میرے دار جی گزر گئے۔

Scanned by CamScanner

نجوم

ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کا سفر اگر طے کیا جائے اور مسلسل ساٹھ سیکنڈ تک کیا جائے تو ایک منٹ کا سفر کروڑوں میل دور لے جائے گا۔ روشنی اسی رفتار سے سفر کرتی ہے!

سفر جاری رہے اور رفتار قائم رہے اور دس ہزار "نوری سالوں" کا سفر طے کرلیں تو ایک ایسے سورج تک پہنچیں گے جو بجھ چکا ہے۔ کروڑہا کروڑ سال جلنے کے بعد! اور اب آخری دنوں پر ہے۔ کبھی کبھی کوئی شعلہ سا بھڑک اٹھتا ہے تو اس کی لپٹیں بیس پچیس ہزار میل کی بلندی تک اٹھتی ہیں۔

سائنس دانوں سے خبر ملتی ہے کہ پچھلی بار جب یہ شعلے بھڑکے تھے تو ان کی روشنی (دس ہزار نوری سال طے کرنے کے بعد) ایک بار ۱۸۴۱ء میں اور دوسری بار ۱۸۵۴ء میں اس زمین پر دیکھی گئی تھی۔ اس سورج کی شکل اب گول سورج کی سی نہیں رہی۔ وہ کسی دری پر گری دوات کی سیاہی کی طرح پھیل گیا ہے۔ کسی بڑی طاقت ور دوربین سے دیکھیں، جس وقت کائنات کا ماحول صاف ہو تو ایک داغ کا سا دکھتا ہے جیسے سکندر کی قمیض کی جیب پر کالے جامنوں کا داغ پھیل گیا ہے جو اکثر وہ اسکول سے آتے ہوئے اپنی جیب میں بھر لیا کرتا ہے۔

کتنا دور ہے وہ سورج! اور اس سورج کا نام بھی ہے... "ایٹا کورنیا" (Eta Corniae): یہ نام ہمیں نے رکھا تھا۔ جیسے کائنات کے باہر سے اس زمین کو دیکھنے والوں نے ضرور ہمارے سورج کا بھی کوئی نام رکھا ہوگا۔ ۱۸۴۱ء کی بات ہے۔ ہندوستان تب ایک ہی تھا۔ مغلیہ خاندان کے آخری بادشاہ اکبر ثانی ابھی ابھی گزرے تھے۔ چار برس چار جیسے چٹکیاں پہلے اور ظفر تخت نشین ہو چکے تھے۔

ابراہیم ذوق، استاد تھے ظفر کے، لیکن ظفر مرزا غالب کی بہت قدر کرتے تھے اور کلو جو بڑا وفادار خادم تھا غالب کا، اکثر منیر سے کہا کرتا تھا:

"باشا اپنے استاد سے چھپ چھپ کے غزل بھیجتے ہیں۔ ہمارے مرزا نوشہ کنے، اصلاح کے لیے!"

"اچھا؟" حیرت سے منیر کی آنکھیں چوڑی ہو جاتیں۔

Scanned by CamScanner

''اور نہیں تو کیا! اماں باشا ہوں یا کچھ، بڑے شاعروں کی تو وہ بھی خوشامد کرتے ہیں۔ آموں کے ٹوکرے آتے ہیں شاہی باغ سے۔''

منیر کا چہرا، انار کی طرح کھل اٹھتا یہ باتیں سن کر۔ آنکھوں میں چنگاریاں روشن ہوا ٹھیں۔ کلو سے کہتا: دیکھ لینا۔ مرزا نوشہ کا ستارہ ایک روز مشعل کی طرح جگمگائے گا۔''

منیر بڑا مرید تھا مرزا غالب کا۔ بہت میل جول نہیں تھا ان سے، بس گلی میں آتے جاتے، بڑی سعادت مندی سے پیشانی چھو کر انہیں سلام کیا کرتا تھا... منیر کو علم نجوم سے بڑا لگاؤ تھا۔

اکثر ایسے لوگوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے سوال کیا کرتا تھا جنہیں اس علم میں دخل تھا۔

''اچھا، یہ بتایئے حکیم صاحب! ستارہ گرتے تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ لیکن ستارے سفر کیوں کرتے ہیں؟ قطبی ستارہ تو شمال میں، اپنی جگہ پر ایسے قائم رہتا ہے جیسے اللہ میاں نے مشعل جلا کے رکھ دی ہو کہ لو بھئی یہ راستہ ہے کاروانوں کے لیے۔ اس طرف کو چلے آؤ۔ لیکن وہ سات ستارے ہیں، جنہیں پنڈت شوناتھ، سپت رشی کہتے ہیں، وہ شام کو اس طرف۔'' منیر نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔ ''اس طرف مسجد کے مینار کی طرف نظر آتے ہیں۔ آدھی رات میں، چھت پہ سوئے سوئے جو آنکھ کھلی تو دیکھا، ساتوں کے ساتوں، یہ بلم لیے میرے سر پر کھڑے ہیں۔ میں تو گھبرا ہی گیا۔ یہ کواکب کب میرے سر پر آ گئے۔ میں حیرت سے دیکھتا رہا کہ اب کیا کریں گے۔ پھر آنکھ لگ گئی۔ صبح کنے دیکھا تو اُدھر کو جا رہے تھے ساتوں، جمنا کی طرف — وہ جدھر کو شاہد رہ ہے۔''

حکیم صاحب نے بڑے تحمل سے سمجھایا۔ ''دیکھو، منیر میاں — یہ آسمان جو ہے نا، یہ پورے کا پورا چڑھتا اور اترتا ہے۔ یہ سمجھ لو کہ تم ایک گنبد میں بیٹھے ہو اور گنبد تمہارے سر کے اوپر سے چل رہا ہے۔ اس گنبد میں سورج چاند ستارے سب جُوے ہوئے ہیں۔ یہ سب ہند سے ہیں، جنہیں صرف اللہ میاں ہی پڑھ سکتے ہیں — وہی حساب کتاب رکھتے ہیں ان کا!''

''اور یا پھر آپ پڑھ سکتے ہیں حکیم صاحب'' منیر خوش ہو کر بولا۔ حکیم صاحب کی بات نے بہت متاثر کیا اسے۔ حکیم صاحب بڑی انکساری سے بولے۔

''استغفر اللہ — ہم کیا ہیں میاں۔ جتنا وہ بتاتا ہے۔ بس اتنا جان جاتے ہیں —''

''اچھا، وس روز جو ستارہ لپک کے گرا تھا آسمان سے اور آپ نے بتلایا تھا کہ کوئی عظیم ہستی گئی اس جہان سے۔ وہی روز باشا اکبر ثانی کا انتقال ہوا —''

''یوں ہے منیر میاں کہ جب ستارہ ٹوٹے کوئی، تو جس جانب گرے اس طرف تباہی کی آگہی ہوتی ہے اور جہاں سے ٹوٹے وہاں سے کوئی عالمی ہستی اٹھ جاتی ہے۔ اب ہمیں یہ خبر تھوڑے تھی کہ

Scanned by CamScanner

وہ باشا سلامت کا ستارہ ہے۔ لیکن ستارے کی روشنی سے اندازہ کیا تھا کہ کسی بڑی درخشندہ ہستی کا وقت پورا ہوا۔ حالاں کہ وہ ستارہ کئی روز سے کانپ رہا تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے۔"

"تو پھر یہ لاکھوں کروڑوں ستارے خدا کے اپنے بندوں کے ستارے ہوں گے۔ اللہ میاں نے ہند سے لگا رکھے ہوں گے۔ کوئی چھوٹا کوئی بڑا—"

"اور کیا—!"

"تو اپنا ستارہ بھی کوئی ہوگا ان میں؟"

حکیم صاحب ذرا تامل سے بولے "ہاں— ہوگا تو ضرور!" اب وہ کچھ کچھ اونگھنے لگے تھے منیر کی باتوں سے! گاؤ تکیے پہ سر ٹیک کے ہاتھ کا پنکھا جھلنے لگے۔ منیر نے فوراً ہاتھ سے پنکھا لے لیا۔ جھلنے کے لیے!

"اچھا، تو حکیم صاحب مرزا نوشہ کا بھی ستارہ ہوگا فلک پر؟"

"ہوں—" حکیم صاحب نے سر تکیے پر ٹکا لیا۔ کھانے کی خماری اب آنکھوں میں چڑھنے لگی تھی۔ منیر نے بڑے رازدارانہ لہجے میں کہا:

"حکیم صاحب— ایک روز تو مرزا نوشہ، باشا کے استاد ہو ہی جائیں گے اور ٹھیک اسی جگہ ان کا ستارہ چمکے گا جہاں استاد ذوق کا ہے۔ ستارے رتبے اور عروج کے مطابق جگہ بھی تو بدلتے ہوں گے۔" لیکن تب تک حکیم صاحب کی آنکھ لگ چکی تھی۔

منیر روز رات کے وقت نظر لگا کے آسمان کے تارے پہچاننے کی کوشش کرتا رہتا تھا—

اسی سال کی بات ہے۔ ۱۸۴۱ء کی۔ ایک ستارہ باقی تمام ستاروں سے زیادہ درخشندہ نظر آیا۔ منیر بے چین سا ہوگیا۔ تڑکے تڑکے حکیم صاحب کے ہاں پہنچ گیا اور ذکر کیا اس ستارے کا۔ حکیم صاحب نے تو دیکھا ہی نہیں تھا کہ اسی روز وہ آگرہ سے واپس آئے تھے اور رات جلدی سو گئے تھے۔ منیر نے اور کچھ لوگوں سے بھی ذکر کیا۔ کسی نے تو دیکھا نہیں تھا اور کسی نے خواہ مخواہ حامی بھر دی۔ وہی ستارہ اگلی رات پھر نمودار ہوا۔ نسبتاً واقعی وہ دوسرے ستاروں سے زیادہ روشن تھا۔ تیسرے روز بھی جب وہ اسی جگہ نظر آیا، تو دلی کے کچھ اور لوگوں نے بھی ذکر کیا اور اس روز تو مزا ہی آگیا جب حکیم صاحب نے سلام کا جواب دیا اور بلا کے بٹھا لیا اسے۔

"ارے منیر میاں۔ کمال کی نظر ہے تمہاری بھئی۔ سنا ہے تمہارے اس ستارے کا ذکر آج قلعے میں بھی ہوا۔ بادشاہ کے دربار میں۔ شاہی نجومی نے کہا ہے کہ بڑی مبارک نشانی ہے جو ہندوستان پر یہ ستارہ جگمگایا ہے۔ نجومی کا کہنا ہے کہ انشاء اللہ مغلیہ خاندان کے دن بہت جلد پلٹیں گے اور پھر سے

Scanned by CamScanner

شان و شوکت لوٹ آئے گی!"

منیر نے ہاتھ اٹھا کر "آمین" کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا:

"انشاء اللہ اپنے مرزا نوشہ کے دن بھی پلٹنے والے ہیں۔ اگلے مہینے ان کا پہلا دیوان چھپ کے آرہا ہے۔ سب اچھے دنوں کی نشانیاں ہیں—" کچھ روز وہ ستارہ فلک پر رہا اور پھر غائب ہوگیا۔ منیر نے بہت تلاش کی اس کی۔ بہت انتظار کیا، شاید وہ کہیں پھر نظر آجائے—

کئی سال گزر گئے۔ دلی کے حالات خراب ہی ہوتے گئے۔ (انگریزوں کی دھاک جمتی گئی) ۱۸۴۴ء میں منیر کی شادی ہوگئی۔ دو تین سالوں میں دو تین بچے بھی ہو گئے۔ لیکن رات کو دیر تک ستارے دیکھنے کی عادت نہ گئی اس کی۔ بڑی تمنا تھی کہ کسی طرح اپنے ستارے کا ٹھکانہ مل جائے۔ پھر تو آس پاس ہی اپنی بیگم اور بچوں کے ستارے بھی ڈھونڈ لے گا۔ لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ حکیم صاحب کی نظر بھی بہت کمزور ہوگئی تھی۔ آسمان پر پہلے ہی کم دیکھتے تھے، اب کاغذوں، کتابوں میں بھی، ستاروں کی حرکتیں کم نظر آنے لگیں— پھر ایک دن ایک اور حادثہ ہوا۔ ۱۸۵۴ء کی بات ہے۔

منیر نے ایک روشن ستارے کو، آسمان پر ایک لمبی لکیر کھینچ کر گرتے دیکھا۔ صبح صبح وہ حکیم صاحب کو خبر دینے جارہا تھا کہ راستے میں خبر ملی استاد ذوق کا انتقال ہوگیا۔ اسے یقین ہوگیا، ہو نہ ہو، وہ انہیں کا ستارہ تھا۔

منیر نے جا کر کلو کو خبر دی اور کلو نے دوڑ کر اپنے آقا مرزا غالب کو خبر کی جو اس وقت اپنے نیم پاگل بھائی یوسف کی تیمارداری میں مصروف تھے۔ لیکن کچھ روز بعد ہی ایک اور اچنبھا ہوا۔

وہی روشن ستارہ، جو اس نے تیرہ سال پہلے ۱۸۴۱ء میں دیکھا تھا، پھر نمودار ہوا آسمان پر۔ ٹھیک اسی جگہ جہاں سے استاد ذوق کا ستارہ فلک سے اترا تھا اور ویسے ہی کئی روز اس مقام پر روشن رہا۔ اسی سال، مرزا اسد اللہ خاں غالب، باشا بہادر شاہ ظفر کے استاد ہوئے اور انہیں نجم الدولہ، دبیر الملک کا خطاب بھی عطا ہوا۔

منیر کو یقین تھا کہ آخر کار اس نے ایک ستارہ تو پہچان ہی لیا اور ہو نہ ہو اس کا ستارہ بھی کہیں آسمان کے اسی علاقے میں ہوگا———

Scanned by CamScanner

نو وارد

ہربنس اپنی قسمت کی پیشین گوئی پڑھ کر اچھل پڑا—

''بس اب اس کی شادی میں کوئی خلل نہیں آ سکتا۔ اس ہفتے تو شادی ہوئی کہ ہوئی— ریما نے کل ہی تو کہا تھا کہ اس ہفتے ہم کورٹ میں جا کر شادی کر لیں۔''— اس نے دوبارہ ''سنڈے ٹائمز'' میں ''ستارے اور قسمت'' کا کالم نکالا اور تفصیل پر غور کرنے لگا—

''اس ہفتے گھر میں ایک نو وارد کی آمد لازمی ہے۔''

ریما کے سوا، اور کون ہو سکتا ہے؟

''نو وارد کی آمد سے خرچوں میں اضافہ ہوگا۔''

ضروری بات ہے— گھر کے خرچے اور دوستوں کی دعوت۔

''قانونی معاملات میں کامیابی حاصل ہوگی۔''

ظاہر ہے شادی کورٹ میں ہوگی۔

''خوش قسمتی کے لیے منگل اور شکر کے دن سبز رنگ کا استعمال کریں۔''

چلے گا!

ایک ایک جملے کی ممکنات کو پرکھ لینے کے بعد ہربنس کو پوری تسلی ہوگئی کہ ''سنڈے ٹائمز'' کا نجومی بہت پہنچی ہوئی چیز ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار آزما چکا تھا۔

پچھلے ہفتے بھی 'ٹائمز' نے کچھ غیر متوقع خرچوں کے بارے میں لکھا تھا اور وہی ہوا۔ حسب معمول وہ اپنے دفتر سے نکل کر پورے چھ بجے ریما کے دفتر پہنچا تھا۔ ریما نے ایک پکچر کے ٹکٹ بک کر رکھے تھے— وقت کم تھا اور انہیں جلدی میں ٹیکسی لینی پڑی تھی۔ واپسی میں بھی وہی ہوا۔ ریما نے کہا تھا— ''دیکھو ساڑھے نو بج رہے ہیں۔ اگر فاسٹ ٹرین نہیں ملی تو گھر پہنچتے دیر ہو جائے گی اور ماں پریشانی کے مارے نیچے سڑک پر ٹہل رہی ہوگی—''

''ٹیکسی!—'' ہربنس نے ہاتھ جھلا کر ایک بھاگتی ہوئی ٹیکسی کو پیچھے سے پکڑ لیا— ''چلو تمہیں

Scanned by CamScanner

ٹیکسی پر چھوڑ دیتا ہوں—" چرچ گیٹ سے پریل تک۔ سارے مہینے کا خرچہ ایک ہی دن میں نکل گیا— لیکن ٹائمز نے تو لکھا ہی تھا۔ اس ہفتے کچھ غیر متوقع خرچے پڑیں گے— اس بار پھر ٹائمز کے نجومی نے وارننگ دی تھی۔

اگلے دن ہربنس نے جا کر ریما کو اس نئے ہفتے کی پیشگوئی دکھائی۔ ریما پڑھ کے بہت خوش ہوئی۔ کہنے لگی— پتہ ہے میرے بارے میں یہی لکھا ہے—"

"کیا لکھا ہے؟"

"کچھ پرانے رشتے داروں سے قطع تعلق اور سفر کی ممکنات!"

"فسٹ کلاس!" ہربنس اچھل پڑا... "میں سوچ ہی رہا تھا کہ دفتر سے چھٹی لے کر ہفتے بھر کے لیے کہیں ہنی مون منانے چلیں گے؟"

دونوں نے پکا فیصلہ کر لیا کہ اس ہفتے میں ضرور کورٹ میں جا کر شادی کر لیں گے اور ہربنس نووارد کی آمد کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔

اسی دن دفتر سے واپسی پر وہ کچھ نئی بیڈ شیٹ اور نئے تکیے کے غلاف خرید لایا۔ نووارد کی آمد سے خرچوں میں اضافہ تو لکھا ہی تھا۔

منگل کے روز جب ہربنس گھر سے نکلا تو خیال آیا کہ خوش قسمتی کے لیے سبز رنگ کا استعمال لکھا ہے۔ بازار جا کر اس نے سب سے پہلے ایک سبز رومال خریدا۔ ساتھ میں ایک درجن لیڈیز رومال کا پیکٹ بھی خرید لیا۔ ریما کے لیے— "سرپرائز گفٹ!"

بدھ کے دن وہ دیر سے دفتر پہنچا۔ صبح ہی صبح نوکر سے گھر کی صفائی شروع کروا دی۔ جتنی فالتو چیزیں جمع ہو گئی تھیں پھینکوا دیں۔ رسوئی میں بہت سارے ڈالڈا کے خالی ڈبے جمع ہو گئے تھے۔ اس نے سب باہر نکلوا دیئے۔ اسٹوو بہت پرانا ہو گیا تھا۔ اس نے نوکر سے کہہ دیا "آج شام کو آتے ہوئے میں ایک نیا اسٹوو لے آؤں گا۔ یہ تم کباڑی کو بیچ دو۔"

"صاحب اچانک یہ سب کیوں؟"

"ارے تجھے پتہ نہیں؟ شکروار کو میں کورٹ میں شادی کر رہا ہوں۔ شادی کے بعد میم صاحب سیدھی گھر پر آئیں گی۔"

غسل خانے میں پلاسٹک کی ٹوٹی ہوئی صابن دانیاں جمع ہو گئی تھیں۔ اس نے پھینک دیں۔ کنگھی کے جگہ جگہ سے دانت گر گئے تھے۔ اس بڑھیا کو بھی اس نے باہر پھینکوا دیا۔ شیشہ چندھیا چکا تھا۔ چونا مل کے اسے خوب صاف کیا، پر کچھ بنا نہیں۔

Scanned by CamScanner

''اس کا تو پانی مر گیا ہے۔ پھینک دے باہر۔'' نوکر نے رسوئی میں لے جا کے اپنے لیے سجا لیا۔ دیوار کو دفتر سے لوٹتے ہوئے ہر بنس قسطوں پر ریڈیو بھی خرید لایا۔ ہفتے بھر میں اس کنواری کٹیا کا رنگ ہی بدل گیا۔

شکر کا دن آیا۔ ہر بنس صبح ہی صبح تیار ہو کر کورٹ پہنچ گیا۔ جیب میں سبز رومال ٹھنسا ہوا تھا۔ ''ہری جھنڈی لین صفا'' کا محاورہ یاد کر کے ہر بنس آپ ہی آپ ہنس دیا۔ ٹائمنر کی کٹنگ ابھی تک اس کی جیب میں تھی۔

ٹیکسی سے اتر کر اس نے دیکھا، وہ کورٹ میں ایک گھنٹہ پہلے پہنچ گیا تھا۔ بیتابی میں ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ ریما نہیں آئی وہ بار بار گھڑی دیکھ رہا تھا۔

گھنٹے بھر میں وہ چار پانچ بار چائے پی گیا۔ مگر ریما نہیں پہنچی۔ دس سے گیارہ... گیارہ سے بارہ... بارہ سے ایک! ڈیڑھ بجے کورٹ کا لنچ ٹائم ہو گیا۔

اس نے ریما کے دفتر فون کیا۔ پتہ چلا ریما دفتر بھی نہیں گئی— اس نے چھٹی لے رکھی ہے— وہ ٹیکسی لے کر ریما کے گھر پہنچا لیکن آج اوپر جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ محلے کے چھوٹے بچے کو بھیج کر اس نے ریما کو باہر بلوایا۔ سہمی ہوئی گھبرائی ہوئی ریما باہر آئی۔

''ہر بنس— آئی ایم سوری!— ماں کو سب معلوم ہو گیا ہے—''

''تو—؟''

''جب سے سنا ہے وہ بیمار پڑی ہیں۔ رات میں دو بار بے ہوش ہو چکی ہیں۔ ہر بنس— میں— میں کورٹ میں شادی نہیں کروں گی— میں جب تک ماں— پلیز سوری—'' روتی ہوئی وہ واپس بھاگ گئی۔

ہر بنس سکتے میں کھڑا، اسے دیکھتا رہا۔

گھر آیا تو ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا تھا۔ نوکر ریڈیو چرا کر بھاگ رہا تھا۔ پڑوسیوں نے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ پولیس اسٹیشن بھی جانا پڑا۔

واپس آتے ہی ٹائمنر کی کٹنگ پھاڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دی اور تکیے میں سر دے کر آنکھیں بند کر لیں۔

اگلے دن اٹھا۔ تیار ہو کر دفتر چلا گیا۔ شام ہوتے ہوتے اس کے گھر نو وارد آ چکا تھا۔ ایک نیا نو کر!!

Scanned by CamScanner

گڈی

کئی بار اسے خود بھی ایسا لگا تھا کہ وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑی ہوگئی ہے۔ جب وہ آٹھویں میں تھی تو دسویں جماعت کی لڑکیوں کی طرح باتیں کرتی تھی اور نویں میں آنے کے بعد تو اسے ایسا لگنے لگا جیسے بڑی دیدی کی طرح کالج میں پڑھنے لگ گئی۔ انہیں کی طرح اس نے اپنی ڈائری لکھنی شروع کردی تھی۔ انہیں کی طرح موڈی ہوگئی تھی۔ انہیں کی طرح گھنٹوں شیشے کے سامنے بیٹھی سنگار کرتی رہتی۔ کئی بار ماں نے ٹوکا تو اسے برا لگا۔

''ہونہہ! دیدی کو تو کچھ کہہ نہیں سکتیں، مجھے ڈانٹ دیتی ہیں۔''

من ہی من بڑبڑا کر وہ چپ ہوگئی۔ لیکن اس دن وہ پھٹ پڑی جس دن دیدی نے اس کے لیے نیا فراک بنایا۔

''میں نہیں پہنتی فراک۔ خود تو اچھی اچھی ساڑھیاں لے آتی ہیں۔ میرے لیے یہ فراک بنا دیا ہے۔''

''گڈو تو بڑی ہو جائے۔''

''گڈو گڈو مت کہا کرو مجھے۔ یہ میرا نام نہیں ہے!''

''اچھا کسم جی آپ بڑی ہو جائیں گی تو ساڑھی بھی لا دیں گے۔''

''میں ابھی چھوٹی ہوں؟ نویں میں پڑھتی ہوں!''

دیدی ہنس پڑی اور وہ پیر پٹختی چلی گئی۔

دیدی پتہ نہیں اپنے آپ کو کس بات پر بڑا سمجھتی ہیں۔ وہ ان سے زیادہ اچھی ڈائری لکھ لیتی ہے۔ ان سے زیادہ پیار بھری باتیں کہہ سکتی ہے۔ دیوراج کی تو شکل بھی اچھی نہیں۔ ایسی اونچی ناک ہے۔ ہاتھ سے پسینہ پونچھتا تو ہاتھ ٹکرا جاتے۔ وہ جسے پیار کرتی ہے وہ تو لاکھوں کا چہیتا ہے۔ سچ مچ فلموں کا ہیرو۔ دیوراج تو اس کے محبوب کی نقل کرتا ہے جو ویسے بال بناتا ہے۔ پل بھر کو تو اسے لگا جیسے دیدی کچھ بھی نہیں۔ دیوراج اور دیدی تو دلیپ کمار اور کسم کی جوٹھن ہیں۔ اس خیال سے اسے

Scanned by CamScanner

بڑی تسلی ہوئی۔ خیالوں ہی خیالوں میں دلیپ کی آغوش میں ڈوب گئی اور آسمان پر بکھرے بکھرے بادلوں کے ٹکڑے جوڑنے لگی۔

کتنی بار وہ اسکول سے بھاگ بھاگ کر اپنے محبوب سے ملنے گئی تھی۔ ساتویں میں تھی یا آٹھویں میں جب اس نے ''مدھومتی'' دیکھی تھی۔ ہائے کتنا اچھا لگتا تھا اس میں دلیپ، پوری بانہوں والی جرسی میں۔ بس۔ اس کے ہونٹوں سے سی نکل گئی۔ اس کا بس چلتا تو وہیں بھاگ کر پردے پر اس کا ہاتھ پکڑ لیتی۔ اس نے جب ہی سوچا تھا وہ دلیپ سے ملے گی تو ضرور ایک پوری بانہوں والی جرسی بن کر دے گی اور پھر ''نیا دور'' میں اس نے دلیپ کو دھوتی میں دیکھا تو اس کے رہے سہے اوسان بھی جاتے رہے۔ اس دن سے تو وہ اس پر بالکل ہی لٹو ہوگئی تھی۔ تانگے کی کمانی پر بیٹھ کر جب ہوا میں چابک لہراتا تھا تو جیسے جان ہی نکال لیتا تھا۔ اسے یہی ڈر لگا رہتا تھا کہیں گر نہ پڑے۔ کئی بار تو تانگے کے دھچکے کے ساتھ وہ خود اپنی سیٹ پر آگے بڑھ گئی تھی اور جب دلیپ دندناتا ہوا ٹوٹے ہوئے پل سے گزرا تھا تو اس نے پل کے نیچے اپنی دونوں بانہوں کا پورا زور لگایا تھا۔ اسے تو تب احساس ہوا تھا جب ساتھ کی سیٹ پر بیٹھی اس کی سہیلی نے ''اوئی'' کر کے اپنا ہاتھ چھڑایا تھا۔ لیکن یہ موٹی مدراسن وجینتی مالا کیوں اس کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ یکلخت وجینتی مالا کے خلاف وہ شدید نفرت سے بھر گئی۔ دھنو! آئی بڑی دھنو! اسے بڑی تسلی ہوئی یہ سوچ کر کہ آخر میں وجینتی مالا مر جاتی ہے۔

وہ بستر سے اٹھی اور جا کر میز کی دراز سے اپنی ڈائری نکالی۔ ڈائری میں ''گنگا جمنا'' کی بک لیٹ پڑی تھی۔ بک کے اوپر دلیپ اور وجینتی کی تصویر تھی۔ اس نے دیدی کی الماری سے قینچی نکالی اور وجینتی کی تصویر کاٹ کر علیحدہ کر دی۔ پھر اسے خوب مسلا اور کھڑکی سے باہر پھینک دی۔ دلیپ کی تصویر کو چوما، اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ تصویر کو احتیاط سے ڈائری میں رکھا اور ڈائری پر سر رکھ کے بکھرے بکھرے بادلوں کے ٹکڑے چننے لگی۔

کب سے ان بادلوں کے ٹکڑے سی رہی تھی۔ لیکن بادل تھے کہ بار بار بکھر جاتے تھے۔ نہ برستے تھے نہ سلنے میں آتے تھے۔ کہاں تک وہ ان بادلوں کو جوڑتی جائے، پروتی جائے۔ کاش وہ ایک بار جم کے برس جائیں تاکہ اس کا کلیجہ ٹھنڈا ہو جائے۔

کاش دلیپ ایک بار مجھے چٹھی لکھے۔ اس نے سوچا۔ جیسی دیوراج دیدی کو لکھتا ہے۔ وہ تو کچھ بھی نہیں۔ دلیپ جو لکھے گا وہ تو اور کوئی لکھ بھی نہیں سکتا۔ اس نے کئی بار اس کے لکھے ہوئے خط فلموں میں سنے تھے۔

Scanned by CamScanner

اس نے ڈائری نکالی اور دلیپ کے نام ایک اور خط لکھنے بیٹھ گئی۔

نویں کا امتحان دیا ہی تھا کہ کسم کی زندگی میں ایک ایسی صبح آئی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ صبح اٹھتے ہی معلوم ہوا ماموں آئے ہیں اور سب دلیپ کمار کی شوٹنگ دیکھنے چلیں گے۔ اسکول سے چھٹی تھی۔ بس بات بن گئی۔ وہ بھی جائے گی۔ اس سے ماموں نے کہہ دیا۔

''چلو تم بھی چلو.....!''

''یہ کیا کرے گی جا کر'' دیدی نے کہا۔

''گڈو آٹوگراف لے لے گی۔''

''اسے گڈو نہ کہیے ماما جی، ناراض ہو جائے گی۔ اب یہ بڑی ہو گئی ہے۔'' دیدی ہنس رہی تھی۔ وہ پھر دیدی سے چڑ گئی۔ جب دلیپ پیار بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھے گا تب پتہ چلے گا وہ کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ وہ تیار ہونے اندر چلی گئی۔ اور دیر تک سنگار میز کے سامنے بیٹھی رہی۔

جب شوٹنگ پر پہنچے تو دلیپ اور وجینتی ایک سین کی ریہرسل کر رہے تھے۔ سہمی سہمی سی وہ ایک طرف کھڑی رہی۔ دلیپ وجینتی کا ہاتھ پکڑے کہہ رہا تھا...

''لتا اب دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجھ سے چھین نہیں سکتی۔ میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہیں پا لیا ہے۔ بتاؤ میرے ساتھ چلو گی لتا۔'' اور لتا نے پیار سے اپنا سر دلیپ کے سینے پر رکھ دیا۔

''بے شرم'' کسم من ہی من میں بڑبڑاتی رہی۔

شاٹ ختم ہوا تو ماموں نے کہا—

''گڈو جاؤ لے لو آٹوگراف۔''

''نہیں مجھے نہیں لینا ہے آٹوگراف!'' وہ بھرا کر بولی۔

''کیا ہو گیا!''

''کچھ نہیں'' یہ کہہ کر وہ باہر چلی گئی۔

جب سب واپس آ گئے تو وہ اپنے کمرے میں گئی۔ دراز سے ڈائری نکالی اور ڈائری سے دلیپ کے فوٹو نکالے اور مسل کر کھڑکی سے باہر پھینک دیئے۔

''جاؤ جاؤ اپنی دھنو کے پاس! تم بھی جاؤ—'' اور بستر پر گر کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

Scanned by CamScanner

خیرو

آدھی رات میں جب چوپال سے خیرو کے گانے کی آواز گونجی تو بہت سوں نے ناک سکوڑ کر گدی کھجا کر کروٹ بدل لی۔

''افوہ! اس پگلے کو دن میں کام نہیں ہوتا، رات میں آرام نہیں۔''

ممدو کی بیوی شاید جاگ ہی رہی تھی۔ سوئی سی آواز میں بولی ''کمبخت کسی کام بھی تو نہیں لگتا۔''

اپنی اپنی کروٹ بدل کر دونوں پھر سو گئے۔ خیرو چوپال پر اکیلا پڑا دیر تک گاتا رہا۔

اس گاؤں میں کسی کو پل بھر کی فرصت نہیں تھی۔ بس وہی تھا جسے پل بھر کو بھی کام نہیں تھا۔ چوپال پر سوتا، چوپال پر جاگتا۔ صبح صبح اٹھ کر ایک رہٹ پر جاتا۔ ایک پیڑ کے کھروڑ پر اپنا جھولا ٹانگتا۔ کپڑے اُتار کر دھوتا اور پھر تب تک نہاتا رہتا جب تک کپڑے سوکھ نہ جاتے۔

کوئی ٹھور ٹھکانہ تو تھا نہیں۔ جاتا کہاں؟ ہوا تو ممدو کے کھیتوں پر نکل گیا۔ لیکن ممدو کو اپنے کھیتوں سے کہاں فرصت تھی کہ وہ اس کی طرف دھیان دیتا۔ وہ بیل جوتے، ہل ٹھونکے، پسینہ پسینہ جلتی دوپہر میں چلتا رہتا۔ کہیں منڈیر سنوراتا، کہیں مٹی کے ڈھیلے پھوڑتا۔ خیرو جھولے سے بانسری نکال کر اس کے ساتھ ہل پر کھڑا ہو جاتا یا کبھی رات کا دیکھا ہوا سپنا سنانے لگتا۔ ممدو کو ہمیشہ الجھن ہوتی۔ نہ اسے منع کر پاتا تھا نہ خود ہٹ سکتا تھا۔

ایک بار جب خیرو نے بیلوں کے سینگ رنگنے کے لیے ہل روکا تھا تو وہ سچ مچ ناراض ہو گیا تھا... ''چل ہٹ! تیری نکمی حرکتوں کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس۔''

خیرو اس وقت تو پیچھے ہٹ گیا۔ لیکن دوپہر کو جب ممدو کھانا کھانے لگا تو اس نے جھٹ سے بیلوں کے سینگ رنگ ڈالے۔ ممدو کی بیوی کھانے کے لیے بلاتی ہی رہ گئی۔ کام، بس کام!!

نجو، ممدو سے کہہ رہی تھی۔ ''جلدی سے کھالو۔ ثمینہ کو جا کر دودھ پلانا ہے۔''

''تا جو کو دوا دے دینا'' ممدو تاکید کرتا۔

''تم کھالو، جب تک میں پانی بھر لوں۔''

Scanned by CamScanner

''صبح نہیں بھرا؟''

''صبح چکی پر گئی تھی۔ آٹا پسوانا تھا۔''

''بش چاچا کے یہاں سے لحاف بھی بھروالینا۔''

''ابھی تو دھان بھی چننا ہے!''

یہ سب کام اسے فالتو سے لگتے تھے۔ لیکن ہر آدمی انہی میں مصروف تھا۔ بہت ہی مصروف!

اگلے دن پھر وہی ہوا۔ ممدو کھانے لگا تو خیرو کو آواز دی۔ خیرو جھولے سے گھنٹیاں نکال کر تاگے میں پرو رہا تھا۔ ''اوئے خیرو! کیا کر رہا ہے؟''

''بیلوں کو گھنٹیاں پہنا رہا ہوں۔ جب چلیں گے تو اچھا لگے گا۔''

''چل آ، کھانا کھالے۔ چھوڑ اپنے بیکار کے دھندے۔ بیل تو چلتے ہی رہیں گے۔ یہی کام ہے ان کا۔''

''تو بھی تو بیلوں جیسا ہی ہے ایک گھنٹی تو بھی باندھ لے!'' خیرو نے مذاق کیا۔

شام کو خیرو پنگھٹ پر پہنچ گیا۔ پیاس لگی تھی، لیکن کسی کو فرصت کہاں کہ اسے پانی پلائے۔ ایک کو جا کر دال بگھارنی تھی۔ دوسری آٹا گوندھ کر آئی تھی۔ تیسری کو بیمار ماں کی فکر تھی۔ ایک نمبو سے گاگر مانجھ رہی تھی۔ دو تین مل کر پانی کھینچ رہی تھیں۔ خیرو ایک طرف بیٹھ گیا۔ جھولے سے اس نے کچھ رنگ نکالے اور ایک مٹکی پر بیل بوٹے بنانے لگا۔

''خیرو!...''

لڑکی نے مڑ کر دیکھا۔ لیکن مٹکی اس کے ہاتھ سے لے نہیں سکی۔ بس یہی تو مشکل تھی۔ خیرو کے سارے کام فالتو کے تھے۔ اسے منع کرتے ہوئے بھی روک نہیں پاتے تھے۔ ہاں بہت ترس آتا تو ''بیچارہ'' کہہ کر چپ ہو جاتے۔ لیکن اس گاؤں میں کام کبھی نہیں رکا۔ جیسے ہی مٹکی والی کی باری آئی اس نے خیرو کی گود میں سے مٹکی لے لی۔ خیرو بھی ماہر ہو چکا تھا۔ وہ کام کے بیچ، انہیں چھوٹے چھوٹے وقفوں میں اپنی جگہ بناتا رہتا تھا۔

ایک بار ہیرا جلاہے کے یہاں ٹھہر گیا۔ ہیرا کھیس بن رہا تھا۔ خیرو بہت دیر تک کھڑا دیکھتا رہا اور تانے کی آواز سنتا رہا۔

''دھنگ تنگ! دھنگ تنگ۔ دھنگ تنگ'' اور پھر گاؤں بھر گھومتا رہا گاتا ہوا... ''دھنگ تنگ۔ دھنگ تنگ...''

اس دن کھیا نے کہا... ''اس کا دماغ چل گیا ہے۔''

Scanned by CamScanner

اگلے دن خیرو پھر وہیں تھا۔ ہیرا کے یہاں... ''ہیرا چاچا تم ایک ہی رنگ کے کھیس کیوں بناتے ہو۔ دو دو تین تین رنگوں کے تاگے کیوں نہیں ملاتے؟''

''میرا دماغ ابھی چوکا نہیں۔ نا اس لیے۔''

''لیکن چاچا وہ دیکھنے میں اچھا لگے گا۔''

''کھیس بچھانے کو ہوتا ہے، دیکھنے کو نہیں۔''

بیچارہ کیا سمجھاتا... ہیرا کی بیٹی برکھا سوت کی ٹوکری سنبھالے سامنے کھڑی تھی۔ وہ ہنس پڑی۔ ٹوکری رکھتے رکھتے برکھا کے بال کندھے پر بکھر گئے۔ پھر برکھا جوڑا گوندھتی ہوئی اندر گئی تو خیرو پتہ نہیں کس بات سے شرما گیا۔

''برکھا...!'' اس نے صاف نام سے پکارا۔ برکھا پلٹ کر کھڑی ہو گئی۔

''مجھے تھوڑا سا سوت دے گی؟''

''کیا کرے گا؟''

''تیرے لیے پراندی بناؤں گا۔'' خیرو جتنا شرمیلا تھا اتنا ہی بے شرم۔ بولا... ''لیکن ایک رنگ کی نہیں۔ سب رنگوں کی ایک ایک پونی دے دے۔''

بیچارے کو بہت دن آنا پڑا وہ سب رنگ جمع کرنے اور جس دن سب پونیاں مل گئیں وہ سارا دن بڑے برگد کے نیچے بیٹھا پراندی بناتا رہا اور گاتا رہا... ''دھتنگ تنگ۔ دھتنگ تنگ...''

سب ہنس کر گزر گئے۔ صرف اس اسکول ماسٹر نے جاتے جاتے پوچھا تھا۔ ''یہ کیا کر رہا ہے خیرو؟''

ایک منٹ تو چپ رہا۔ پھر ہنس کر جواب دیا... ''گھنے گھنے بالوں کے لیے پراندی بن رہا ہوں...''

کام کرتے تو اسے سچ مچ کسی نے نہیں دیکھا تھا لیکن یوں بھی نہیں دیکھا کہ جب وہ کچھ نہ کر رہا ہو...

صبح رہٹ سے لے کر رات چوپال پر آنے تک پتہ نہیں وہ کتنی بار گاؤں میں گھوم جاتا۔ ہزار بار کسی دروازے کے آگے گزرنے کے بعد اچانک ایک دن اسی دروازے پر رک جاتا۔ جھولے سے چاقو نکال کر فوراً اس پر کوئی تصویر کھود دیتا۔ کہیں مور، کہیں ہرن تو کہیں سواستک کا نشان بنا دیتا۔ اس ایک جھولے کے علاوہ اس کی اور کوئی پونجی نہیں تھی۔ پھر گھومتا وہ اس طرح تھا جیسے سارے گاؤں کا مالک ہو۔ جس جگہ جی چاہا ٹھہر گیا۔ جس طرف جی چاہا، چل دیا... جس نے برداشت کر لیا اس

Scanned by CamScanner

کے پاس بیٹھ گیا۔ کسی نے ہٹا دیا تو وہاں سے اٹھ گیا۔ کسی نے کچھ دیا تو اپنا لیا، کسی نے کچھ مانگا تو سونپ دیا۔ دور کا سفر اور کہیں کا سفر نہیں...

اور آدھی رات جب سب سو جاتے، وہ اپنی آواز سے سارے گاؤں کو جگا دیتا۔ ناک سکوڑ کر لحاف جھٹک کر پھر کروٹ لے لیتا۔

وہ جو دھیرے دھیرے آ رہا تھا۔ ایک دن اچانک آ پہنچا۔ کب تک کوئی اسے مفت میں روٹی دیتا؟ اس کے لیے گرم سرد کپڑوں کا دھیان رکھتا؟ خیرو بھوکا پھر بیمار رہنے لگا۔ مگر اپنے رنگوں میں سارے دکھ چھپائے رہا۔ چپ چاپ سہتا رہا۔ اور—

ایک دن کھیا نیند سے اٹھ کر چوپال پر چلا آیا... ''حرام خور'' ایک ہی تھپڑ میں بیچارہ خیرو زمین پر آ رہا۔ کھڑکیاں جو کھلی تھیں وہ بھی بند ہو گئیں۔

اس صبح لگ بھگ ہر شخص چوپال سے ہو کر گزرا۔ خیرو کہیں نہیں تھا۔ اس کا جھولا ویسے کا ویسا ہی لٹکا ہوا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے پوچھتے رہے۔ کسی نے رہٹ پر بھی نہیں دیکھا۔ کھیتوں پر بھی نہیں، پنگھٹ پر بھی نہیں۔

پہلی بار لوگوں نے دروازوں کے مور ٹٹولے۔ پہلی بار محمدو نے ہل روک کر بیلوں کی گھنٹیاں چھو کر دیکھیں۔ کسی نے پنگھٹ پر آہ بھر کر مٹکی گود میں لے لی۔ کام جو کبھی نہیں رکا تھا آج قدم قدم پر رک کر انتظار کر رہا تھا۔ خیرو کا نام جیسے ہونٹوں سے اٹھ کر آنکھوں میں آ گیا۔

رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چوپال پر بس ایک اکیلا جھولا لٹکا ہوا تھا اور— اس کی آواز کے بغیر سارا گاؤں جاگ رہا تھا۔

Scanned by CamScanner

لیکن

اچانک دیوراج نے مجھے بانہہ پکڑ کے کھینچا... ''کیا کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں گاڑی آ رہی ہے؟ تمہیں سگنل دکھائی نہیں دیتا؟''

مجھے لگا، بات کچھ حد سے باہر نکل گئی ہے۔

اب ''اڑن'' ریلوے اسٹیشن نہیں ہے۔ کبھی تھا۔ اب صرف اس کا بچا کھچا ڈھانچا سا باقی ہے۔ جیسے آدمی گزر گیا، پنجر باقی ہے۔ لیکن میں نے ایک زمانے میں اسے زندہ جاوید دیکھا تھا۔ اس زمانے میں پاس ہی ایک کیمیکل پلانٹ لگ رہا تھا۔ اسی کے لیے یہ پٹریاں بچھائی گئی تھیں۔ ریل پر سامان آیا کرتا تھا۔ لوگ بھی آتے تھے۔ پھر وہ پلانٹ مکمل ہو گیا۔ لیکن اسٹیشن سے کچھ دور چھوٹی سی ایک بستی بس گئی۔

آخری اسٹیشن اب ''اڑن'' نہیں ہے ''پنویل'' ہے۔ کوئی پانچ میل پیچھے۔ یہ بستی تو دھیرے دھیرے بڑھنے لگ گئی ہے۔ لیکن اڑن کا اسٹیشن سب سے الگ تھلگ ویسے ہی ویران پڑا ہے۔

میں شام کو اکثر ٹہلتا ہوا، اس اڑن اسٹیشن کے کھنڈر جیسے مقام پر سیر کرنے نکل جاتا تھا۔ پٹریاں اب جن کے چاروں طرف گھاس اور جنگلی پودے اگے ہوئے ہیں اور وہ خستہ سی اجڑی ہوئی اسٹیشن بلڈنگ۔ ایک اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ، ایک گودام جیسا اسٹور روم، چھوٹا سا احاطہ اور بس — کچھ سیمنٹ کے بینچ بھی تھے۔ ٹکٹوں والی کھڑکی کیوں موجود تھی، پتہ نہیں۔ لیکن آثار دیکھ کر پتہ چلتا ہے کہ ٹکٹ لینے والے مسافر بھی رہے ہوں گے اور یوں تھا تو ٹکٹ چیکر بھی ضرور ہوگا کیوں کہ دروازہ تو نہیں ہے۔ لیکن گرل (Grill) والے دروازے کا فریم اب بھی کھڑا ہوا ہے۔ سیمنٹ کی دیواروں میں دھنسی ہوئی۔ یہیں ایک بار دیکھا تھا دیوراج کو — وہ دور والی سیمنٹ کی بینچ پر بیٹھا تھا۔ میرے سگریٹ جلانے سے اس نے مجھے مڑ کر دیکھا تھا۔ بہت سنجیدہ لگا تھا اس کا چہرہ۔ میں نے سوچا تھا شاید میرا سگریٹ پینا اسے پسند نہیں۔

اسے کئی بار دیکھا۔ دو ایک بار مجھ سے پہلے ہی اٹھ کر چلا گیا۔ دو ایک بار میرے جانے تک

Scanned by CamScanner

وہیں بیٹھا رہا۔ مجھے جاتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔

پھر ایک روز میں نہیں گیا۔ اپنی پنشن کے سلسلے میں بمبئی شہر تک جانا پڑا۔ لوٹنے میں دیر ہوگئی۔

اگلی شام جب میں گیا تو دیوراج اپنی بینچ سے اٹھ کر گھاس میں رینگتی ہوئی زنگ آلود پٹری کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میرے پاس آ گیا۔ بولا ''کل شام نہیں آئے؟''

''نہیں بمبئی سے لوٹتے دیر ہوگئی تھی۔''

''اچھا اچھا...!'' وہ مسکراتا ہوا اسٹیشن سے باہر چلا گیا۔ اسٹیشن جو، اب نہیں مگر کبھی تھا۔ گرل (Grill) والے فریم کے پاس وہ ذرا سا رکا اور چلا گیا۔

ایک شام بارش تھی تو میں نہیں گیا۔

اگلی شام پھر دیوراج نے پوچھا... ''کل نہیں آئے؟''

''ہاں بارش تھی اس لیے نہیں آیا۔''

''اچھا اچھا! پتہ ہے کل گاڑی آئی تھی!''

''جی؟'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔

''ہاں۔ مجھے پتہ تھا کہ گاڑی آئے گی تو وہ بھی آئے گا۔''

''کون؟''... میں نے پوچھا۔

''میرا بیٹا شیام! سات پچاس کی گاڑی سے آیا تھا۔ وہاں ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دے رہا تھا جب میں نے پہچان لیا۔''

مسکراتا ہوا خوش خوش دیوراج اس شام بھی واپس چلا گیا۔ لیکن میرے لیے ایک الجھن چھوڑ گیا... ''سات پچاس کی گاڑی سے آیا تھا۔ کیا مطلب؟'' سات پچاس کی گاڑی ''پنویل'' پہنچتی ہو شاید۔ لیکن ''وہاں ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دے رہا تھا''... کا کیا مطلب؟ مجھے لگا بوڑھا خبطی ہے۔ کوئی خلل ہے دماغ میں!

اگلے روز میں دو پٹریوں کے بیچ بیچ چل رہا تھا۔ جب دیوراج پیچھے سے آیا اور میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ''آج مجھے آنے میں دیر ہوگئی''... اس نے کہا۔

ہوں کہہ کے میں چپ ہوگیا۔ لیکن رہا نہیں گیا۔ میں نے پوچھ ہی لیا۔ ''کل شیام کہاں ملا تھا آپ کو؟''

''وہ؟... وہاں!'' اس نے اشارہ کیا اور مسکرا دیا۔ ''ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دے رہا تھا جب میں نے پہچان لیا۔ مجھے معلوم تھا ایک نہ ایک دن آئے گا ضرور!''

Scanned by CamScanner

میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تو وہ سمجھ گیا۔ ''تم سوچتے ہوگے یہ بڈھا خبطی ہوگیا ہے۔ ہے نا؟''

میں نے 'ہاں' میں سر ہلا دیا...

''میں جانتا ہوں، اب یہاں کوئی گاڑی نہیں آتی۔ لیکن ایک زمانے میں آیا کرتی تھی۔ ہر روز باقاعدہ سات پچاس پر! اور ہر روز میں اسے لینے آیا کرتا تھا۔ پھر ایک روز ایک حادثہ ہوگیا۔ تم نے اخبار میں پڑھا بھی ہوگا۔ ایک آدمی یہ پٹری پار کرتے ہوئے گاڑی کے نیچے آگیا۔ اس کی لاش تین ٹکڑوں میں اٹھائی گئی۔ وہ میرا بیٹا تھا... شیام!''

مجھ پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ کچھ دیر ہم لوگ چپ چاپ چلتے رہے۔ پھر میں نے پوچھا...

''آپ کو یاد ہے؟... وہ گاڑی کے نیچے کٹ کر مر گیا تھا۔''

''ہاں—!''

''اور آپ پھر بھی اس کا انتظار کرتے ہیں؟ اور آپ کو لگتا ہے کہ آپ اس سے ملے بھی؟''

ہاں! ایک واہمہ ہی تو ہے۔ زندگی اور موت دونوں ہی واہمے ہیں۔ ایک ذہنی کیفیت سے نکل کر ہم دونوں دوسری ذہنی کیفیت میں داخل ہو جاتے ہیں اور جو حقیقت ہے اسے ہم واہمہ یا سراب یا مایا کہتے ہیں۔''

''حقیقت کیا ہے؟''

''تلاش... امید... انتظار!''

''تلاش؟ کس چیز کی؟''

''وقت کی! جو مستقل ہے!''

''وقت؟ وہ تو گزر جاتا ہے!''

''جو گزر جاتا ہے وہ وقت نہیں۔ میں اور آپ ہیں۔ وقت تو رہتا ہے۔ کچھ نکا رہتا ہے۔ کچھ بہتا رہتا ہے!''

''لیکن جب ایک زندگی کا وقت ختم ہو جاتا ہے تو...''

''وقت ختم نہیں ہوتا۔'' اس نے بات کاٹی۔ ''زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ وقت تو خرچ ہوتا ہے۔ ہوتا رہتا ہے۔ پھر بھی ختم نہیں ہوتا۔''

میں ذرا سا رکا۔ پھر پوچھا... ''آپ نے کرشنا مورتی کو پڑھا ہے کیا؟''

''ہاں یو۔ جی۔ کو پڑھا ہے۔''

Scanned by CamScanner

مجھے لگا یہ سب یو۔جی۔ کے فلسفے کا اثر ہے۔ پھر اس نے پلٹ کے مجھ سے پوچھا... ''تم نے پڑھا ہے یو۔جی۔کو؟''

''نہیں! میں نے تو جے کرشنا مورتی کے لیے پوچھا تھا۔''

''یو۔جی۔ کرشنا مورتی کو بھی پڑھ کے دیکھو!''

''آپ کے پاس ان کی کوئی کتاب ہے؟''

اس بار وہ رکا۔ پھر کرتے کی جیب ٹٹول کر بوسیدہ سا ایک کارڈ نکالا۔ ''کبھی گھر پر آ کے لے جانا۔''

کارڈ پر اس کا نام لکھا تھا۔ ۶/۹، بی۔ پی۔ کالونی اڑن الیٹ! اچانک اس نے مجھے بازو سے کھینچا۔

''کیا کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں گاڑی آ رہی ہے! تمہیں سگنل دکھائی نہیں دیتا؟''

چلتے چلتے ہم لوگ پرانے سگنل والی جگہ پر آ گئے تھے۔ مجھے لگا بات کچھ حد سے نکل گئی ہے۔

اس کے بعد دو روز میں وہاں نہیں جا سکا۔ تیسرے روز مجھے واقعی اس کا انتظار رہا۔ لیکن وہ نہیں آیا۔ چوتھے پانچویں روز بھی نہیں۔

مجھے کسی کام سے دلی جانا تھا۔ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ نہ جانے کارڈ کہاں رکھ دیا تھا۔ لیکن پتہ مجھے زبانی یاد ہو گیا تھا۔ ''۶/۹، بی۔ پی۔ کالونی'' سو میں اس کے گھر چلا گیا۔

دروازہ ایک نوجوان لڑکے نے کھولا۔ پتہ نہیں میرے چہرے پر کیا تاثرات ہوں گے۔ اس نے کچھ پوچھا بھی نہیں۔ کہا... ''آیئے اندر آ جایئے۔''

اندر دیوراج کی تصویر لگی تھی۔ اس پر ایک مالا چڑھی ہوئی تھی۔ میرے دل میں خدشہ سا پیدا ہوا۔ شاید گزر گئے! میں نے پوچھا ''یہ تصویر کس کی ہے؟''

''میرے پتا جی کی!''

''آپ کا نام؟''

''شیام چندر دیوراج!''

''اوہ—!''

''آپ کس سے ملنے آئے تھے؟ میں نے سمجھا شوبھا کے ٹیوٹر ہیں؟''

''نہیں!— میں— اب کیسے کہوں؟— یو۔جی۔ کرشنا مورتی کی کتاب لینے آیا تھا۔ ایک بار آپ کے پتا جی نے کہا تھا— اور—''

Scanned by CamScanner

''اچھا اچھا۔ ان کی کتابیں تو ہم نے صندوق میں بند کر کے رکھ دی ہیں۔ کسی اور دن آئیں تو نکال دیں گے۔ آپ کی ہے؟''

''نہیں رہنے دیجئے۔'' میں اٹھ کھڑا ہوا۔ کتاب تو ایک وجہ بن گئی۔ اصل میں تو دیوراج جی سے ملنا تھا۔ لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ—''

''اچھا اچھا—'' شیام کا چہرہ ہلکا سا اتر گیا۔

میں نے ہمت کر کے پوچھا تھا— ''کیا ہوا تھا؟''

''تین سال ہوئے— اڑن اسٹیشن پر ایک گاڑی کے نیچے آ کے کٹ گئے تھے۔'' میں چکرا گیا۔

خود کو سنبھالنے کے لیے میں فوراً ہی چل پڑا۔ میرے گھٹنے بری طرح کانپ رہے تھے۔ میں سیڑھیاں اتر رہا تھا۔ اتر رہا تھا۔ اترتا ہی جا رہا تھا۔

Scanned by CamScanner

اونچی ایڑی والی میم

اور یہ بات سارے محلے میں پھیل گئی کہ جھبا کے پاری سیٹھ نے اسے سائیکل انعام میں دی ہے۔

کپڑے دھوتے مہکو کے ہاتھ رک گئے۔ اس کا منہ چھوٹا سا ہو گیا۔ جیسے جھبا کی سائیکل نہیں محلے میں اس کی سوت آ گئی ہو۔ مہکو جو اتنے دن سے اپنے پنجابی سیٹھ کی شیخیاں بگھارتا تھا، وہ سب جیسے صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھنے لگیں۔ اس کے پنجابی سیٹھ نے تو وعدے کر کے بھی اسے سائیکل نہیں دی۔ لیکن جھبا نے خود مانگ کے حاصل کر لی۔

جھبا سامنے کی ہودی میں کپڑے دھو رہا تھا اور بار بار کنکھیوں سے مہکو کی طرف دیکھ لیتا۔ ایک دفعہ جب دونوں کی نگاہیں مل گئیں اور جھبا نے مسکرا کر منہ نیچے کر لیا تو مہکو کے سینے میں تو جیسے آگ ہی لگ گئی۔ وہ کپڑے کو زور سے پٹخ کر اندر چلا گیا اور چادر تان کے سو گیا۔ لیکن نیند کہاں؟ بڑی دیر تک مہکو پہلو بدلتا رہا اور جھبا کو نیچا دکھانے کے لیے قسم قسم کے منصوبے باندھتا رہا۔ نہ جانے اسے جھبا سے کیا بیر تھا۔ کئی دفعہ اس نے جھبا کے اکے ڈکے کپڑے بھی غائب کر دیئے تھے۔ جان بوجھ کر اس کا صابن بھی پانی میں بہا دیا تھا۔ لیکن ان سب باتوں سے اس کے کلیجے کو ٹھنڈک نہیں پہنچی۔ جھبا سے تو اسے جنم جنم کا بیر تھا۔

پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا، حالانکہ جھبا اس کے بچپن کا یار تھا۔ گاؤں میں دونوں اکٹھے کھیلتے تھے، اکٹھے پڑھتے تھے۔ ایک ساتھ کبڈی کے میچ کیے تھے۔ رام لیلا کے ڈرامے رچائے تھے۔ دونوں بڑے پکے یار تھے۔ لیکن نہ جانے کیوں جب دو سال پہلے مہکو بمبئی سے گیا تو جھبا کے ساتھ زیادہ گھل مل نہیں سکا۔ جھبا اسے گنوار کا گنوار ہی نظر آیا۔ وہی ڈھیلی ڈھالی سی دھوتی اور وہی بھورا سا کرتا، نہایت گندہ اور میلا۔ ابھی تک وہ دھوتی سے ناک پونچھتا تھا۔ کھانا کھا کے کرتے سے ہاتھ پونچھ لیتا تھا۔ دن بھر باپ کے ساتھ مٹی بھوسے میں کام کرتا اور جب شام کو رہٹ پر نہا کر اسی میلی دھوتی سے بدن پونچھتا تو مہکو کو ایسا لگتا جیسے جھبا ابھی بہت پیچھے ہے۔ اس کے معیار سے بہت نیچے ہے۔ کہاں

Scanned by CamScanner

جھبا اور کہاں وہ! کہاں ایک اجڈ گنوار اور کہاں وہ شہر کا سجیلا نوجوان جو روز دھلے ہوئے صاف کپڑے پہنتا تھا۔ انہیں گھر میں استری بھی کیا کرتا تھا۔ ہاتھ میں ایک رنگین رومال بھی رکھتا تھا۔ وہ کبھی زمین پر نہیں بیٹھا۔ کبھی بڑے برگد کے نیچے پڑی ہوئی سل کے نیچے نہیں لیٹا۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے میں ایک سلیقہ تھا۔ ایک ڈھنگ تھا اور جھبا؟ ہونہہ...!

وہ تو مجکو یہاں نہیں تھا، اس لیے جھبا کا داؤ چل گیا۔ ورنہ جھبا کیا جانے عشق کیسے کیا جاتا ہے؟ اسے پورا پورا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن بٹو جولاہے کی بیٹی ضرور اس کے ساتھ آ پھنسے گی۔

وہ دن میں کئی مرتبہ بٹو کے گھر کے سامنے سے گزرتا۔ آہستہ آہستہ ٹہلتے ہوئے برگد والی گلی سے نکلتا۔ لیکن بٹو کے گھر کے پاس پہنچ کر اس کے قدم تھرتھرا جاتے۔ اس کی سانس تیز ہو جاتی اور گھبرایا گھبرایا سا تیزی سے بٹو کے گھر کے سامنے سے گزر جاتا۔ اس نے گھبراہٹ میں کبھی گردن گھما کے بھی نہیں دیکھا کہ بچھی اسے دیکھ رہی ہے یا نہیں۔ صرف دھپ دھائیں دھپ کی آواز اس کے کانوں میں رہ جاتی اور بٹو کا تانا اس سے دور ہوتا جاتا۔

شام کو جب وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ چوپال میں جا کر بیٹھتا تو بمبئی کے بارے میں بڑی لمبی لمبی ہانکتا۔ لڑکے بڑے غور سے اس کی باتیں سنتے۔ منہ کھولے اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ دو منزلہ موٹروں کا ذکر انہیں حیران کر دیتا۔ لفٹ ان کے لیے جیسے کسی دوسرے جہاں کی چیز تھی۔ وہ کیسی مشین ہوگی جس کا بٹن دبانے سے کمرے کا کمرہ اوپر چلا جاتا ہے اور کمرے کا کمرہ نیچے آ جاتا ہے اور تو اور اس کے دروازے بھی خود ہی کھلتے ہیں اور خود ہی بند ہو جاتے ہیں۔

''پھر تو علی بابا کے پاس وہی مشین ہوگی۔'' مجورا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ اگر ایسی مشین ہاتھ لگ جائے تو پھر عیش ہو جائے۔ کسی پہاڑ کی چوٹی پر چھپنے کی جگہ بنا لے اور آس پاس کے گاؤں میں خوب ڈاکے مارے۔ لیکن وہ غریبوں کی ضرور مدد کرے گا۔ اس سے بڑا نام ہوتا ہے۔ سلطانہ ڈاکو بھی تو یہی کرتا تھا۔ لیکن کیوں نہ مجکو کو اپنے ساتھ ملا لیں۔ اس نے مجکو کی طرف دیکھا۔ نجانے کب اس نے بائیسکوپ کی بات شروع کر دی تھی۔

''یہ نرگس ثریا تو وہاں ایسے گھومتی رہتی ہیں جیسے یہاں مالتی اور بچھی وغیرہ۔'' بچھی کا نام منہ پر آتے ہی وہ کنپٹیوں تک لال سرخ ہو گیا۔ اس نے چپکے سے جھبا کی طرف دیکھا۔ وہ جانے کب وہاں سے کھسک گیا تھا۔ ضرور بچھی سے ملنے گیا ہوگا۔ اس نے من ہی من میں سوچا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بھی چوپال سے اٹھ کر گھر چلا آیا۔

رات کو دیر تک بستر پر پڑا وہ بچھی کے بارے میں سوچتا رہا۔ اس نے دیکھا جب بھی وہ بٹو کے

Scanned by CamScanner

گھر کے سامنے سے گزرتا ہے۔ بچھی کی آنکھیں کھڑکی پر ٹکی رہتی ہیں۔ اسے دیکھتے ہی اس کے ہاتھ رک جاتے ہیں۔ تانا کھینچ کر ٹوٹ جاتا ہے اور بنو کی بھاری آواز اس کے سر کے اوپر سے پھڑپھڑاتی ہوئی گزر جاتی ہے۔

''بیٹا آج کل کیا ہو گیا ہے تجھے؟ دیکھ تو بنائی میں کتنی گرہیں پڑ گئی ہیں۔'' لیکن بچھی کھوئی کھوئی سی نظروں سے کھڑکی کے باہر دیکھتی رہتی۔ دھیمی سی آواز میں کہہ دیتی...

''کچھ نہیں باپو بس تانا الجھ گیا ہے۔''

لیکن بھولے بنو کو کیا معلوم کون سا تانا الجھ گیا ہے۔ اسے کیا معلوم کہ بچھی کے دل میں گرہیں پڑی ہوئی ہیں۔ وہ مہکو کے عشق میں کیسے تڑپ رہی ہے۔ پھر اس نے دیکھا کہ بچھی کی ماں دروازے میں بیٹھی اس کی چوٹی گوندھ رہی ہے۔ جونہی مہکو کلف لگے کپڑے پہنے ریشمی رومال منہ پر رکھے ان کے گھر کے سامنے سے گزرا۔ بچھی دھک سے رہ گئی۔ اس کا بس چلتا تو وہ بال چھڑا کر بھاگتی اور مہکو سے لپٹ جاتی اور اس کے سینے پر سر رکھ کر خوب روتی اور کہتی... ''نرموہی! تم نے میرا دل چرا لیا ہے۔ میری راتوں کی نیند چرا لی ہے۔ تمہارے بن مجھے ایک پل بھی چین نہیں ہے۔ تمہارے بن میں ایسے جی رہی ہوں جیسے پانی بن مچھلی۔'' لیکن اس کی ماں جو بیٹھی تھی وہ یہ سب کیسے کہتی، کیسے کرتی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے دیکھا وہ ماں باپ کے بندھن توڑ کر چلی آئی۔ اس کے پاؤں پڑ گئی اور رو رو کر کہتی رہی... ''مجھے اپنے ساتھ لے چلو میں تمہارے بن نہیں جی سکتی۔'' مہکو کے ہونٹ ایک فتحیاب مسکراہٹ سے پھیل گئے۔

اس نے دیکھا جھبا، اس کا رقیب سامنے برگد کے نیچے کھڑا یہ سب دیکھ رہا ہے۔ اسے لگا جیسے وہ کسی فلم کا ہیرو بن گیا ہو۔ بچھی کہتی رہی...

''مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔'' اس نے فلمی ہیرو کے انداز میں بچھی کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''تم میرے ساتھ کہاں کہاں جاؤ گی در بھاگنی۔ میرے جیون میں بہت کٹھنائیاں ہیں۔''

''نہیں نہیں، میں تمہیں یہ دکھ نہیں دے سکتا۔ نہیں نہیں۔'' وہ اپنا ہاتھ چھڑانے لگا۔ وہ زور سے ہاتھ کھینچنے لگا... گال پر طمانچہ پڑا تو دیکھا باپ ہاتھ پکڑے اسے جگا رہا تھا اور مہکو کہہ رہا تھا...

''نہیں نہیں، میں تمہیں یہ دکھ... ہیں؟... باپو! ہاں اٹھتا ہوں۔'' چارپائی سے اٹھا تو دیکھا بچھی آنگن میں کھڑی دیکھ رہی ہے اور پلو میں منہ چھپائے ہنس رہی ہے۔

دراصل مہکو بمبئی کیا آیا، کوا اپنی چال ہی بھول گیا۔ گاؤں کے سارے لڑکے اسے پھسڈی

Scanned by CamScanner

پھسڈی سے لگتے۔ پڑھے لکھے نہ ہوں تو پڑھے لکھوں کے سے طور طریقے تو ہوں۔ بس گنوار کے گنوار۔ بھوندو کے بھوندو۔ کتنے بڑے ہو جاتے ہیں پھر بھی وہی مٹی میں کبڈی کھیلتے ہیں، گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں۔ کھیتوں کی منڈیروں پر الاؤ جلا کر گھر کے برتن پیٹتے ہیں اور دیہاتی گانے گاتے ہیں۔ کبھی بائیسکوپ نہیں جاتے۔ کبھی ثریا کا گانا نہیں گنگناتے۔ یہ لوگ کیا جانیں شہر میں کیسے رہا جاتا ہے۔ کہیں بچھی دو دن شہر میں رہ لے تو پھر کبھی جھبا کا منہ نہ دیکھے۔ جھبا! ہونہہ۔ جھبا!... سالے کا نام تو دیکھو جھبا۔

مہکو اور جھبا کے درمیان یہ خلیج بڑھتی رہی۔ درحقیقت جھبا کے دل میں کوئی میل نہیں تھا۔ کوئی رنجش نہیں تھی۔ اب بھی وہ پہلے کی طرح مہکو سے ملتا تھا۔ بڑے رکھ رکھاؤ سے بات کرتا۔ لیکن مہکو تو بس اندر ہی اندر بھرا پڑا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو جھبا کو میلے کپڑوں کی طرح گھاٹ کے پتھر پر پٹخ پٹخ کر مار دیتا اور اندر جا کر گہری نیند سو جاتا۔

مہکو نے ایک کروٹ بدلی اور چادر کو زور سے کھینچ کر اپنے گرد لپیٹ لیا۔ ''سالا بمبئی کیوں چلا آیا؟ کس نے بھیج دیا اسے بمبئی۔ حرام کا تخم...'' اس نے دل ہی دل میں ایک اور موٹی سی گالی جھبا کو دی۔

مہکو نے اس کے کچھ گاہک توڑنے کی بہت کوشش کی تھی۔ ان کے اکا دکا کپڑے چرا کر غائب کر دیئے۔ کبھی پھاڑ بھی دیئے۔ کبھی موقع پا کر استری سے جلا بھی دیئے۔ لیکن وہ پلاسٹک کے برتن سالے نہ ٹوٹنے تھے نہ ٹوٹے! اس نے کم داموں پر بھی ان کے کپڑے دھونے چاہے۔ لیکن جھبا نے پتہ نہیں، کیا عمل پڑھ دیا تھا ان پر کہ وہ گاہک اسے نہیں ملے۔ خاص طور پر اس پارسی سیٹھ کے لیے تو اس نے بہت ہی کوشش کی تھی جو جھبا پر اس قدر مہربان تھا۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے اسے کچھ نہ کچھ بخشش دے دیتا تھا۔ تھوڑی دیر کے لیے تو اسے پارسی سیٹھ پر غصے آنے لگا۔ سالا حرام کی کمائی ہے۔ خوب لٹاتا ہے۔ کیا جاتا ہے اس کا اور جھبا تو ہے ہی بھک منگا! اب یہ بھی کوئی مانگنے کی بات تھی۔

جب پہلی دفعہ جھبا کے سیٹھ نے ایک گرم پتلون اسے انعام میں دی تو مہکو بہت جلا بھنا۔ جھبا پتلون پہن کر بائیسکوپ چلا تو مہکو نے راستے میں اس کا مذاق اڑایا۔ وہ مذاق اڑایا کہ بے چارہ آدھے راستے سے واپس لوٹ گیا۔

مہکو نے جانا کہ اس نے میدان مار لیا۔

لیکن دوسرے دن جھبا پھر اپنے پارسی سیٹھ کی تعریف کر رہا تھا۔ ''معلوم ہے اپنے سیٹھ نے کپڑا استری کرنے کے لیے ایک اتنی بڑی میز انعام میں دی ہے۔'' اس نے دونوں ہاتھ پھیلا کر

Scanned by CamScanner

کہا...

''کہاں ہے؟'' مہکو نے بھیگے چہرے سے پوچھا۔

''کل لاؤں گا۔''

''ابے وہ کیا دے گا کل بھی کبھی آئی ہے۔''

اور اگلے دن جھبا واقعی میز اٹھا لایا۔ دور ہی سے مہکو کو للکار کے بولا... ''کیوں مہکو دیکھ لیا؟ آ گئی میز۔''

''ابے تو نے کون سا تیر مار دیا تیرے سیٹھ نے جو ایک ٹوٹی ہوئی میز دے دی۔''

''دل چاہئے اس کے لیے بھی، دل۔'' جھبا کچھ مہکو کو سمجھنے لگا تھا۔'' ہے کوئی ایسا گاہک تیرا جو استری گرم کرنے کے لیے کوئلہ ہی دے دے تجھے۔''

چوٹ واقعی کراری تھی۔

''جا جا۔ بہت دیکھے دل والے۔'' مہکو چہکا... ''دل تو اپنے پنجابی سیٹھ کا دیکھ جو مجھے سائیکل لے کر دے رہا ہے۔ اس ٹوٹی ہوئی میز میں کیا رکھا ہے۔'' مہکو نے بالکل بے پر کی اڑا دی۔

''اگر وہ پنجابی سیٹھ تجھے سائیکل دے دے نا تو تیری ٹانگ تلے سے نکل جاؤں۔'' جھبا شاید مہکو کی نبض خوب پہچاننے لگا تھا۔

''رہی... اور نہیں تو تو بھی اپنے سیٹھ سے سائیکل مانگ کر دیکھ لے۔ اگر دے دے تو میں اپنی مونچھ منڈوا دوں گا۔''

''رہی یہ بھی رہی۔'' جھبا بھی طیش میں آ گیا۔

انہی دنوں مہکو کے پنجابی سیٹھ کی شادی ہوئی تھی اور مہکو نے پہلے ہی اس سے انعام کا وعدہ لے رکھا تھا۔ موقع غنیمت جان کر مہکو نے سائیکل طلب کر لی۔ سیٹھ نے کوئی جواب نہ دیا۔ مہکو نے جب دو تین بار زور دیا تو اس نے کہہ دیا... ''بی بی گھر آئے گی تو اس سے لے لینا۔ اب تو وہی مالکن ہے۔''

کئی ہفتے وہ بی بی کا انتظار کرتا رہا۔

بی بی آئی تو اپنے ساتھ مٹھائی کا بہت بڑا ٹوکرا لے کر آئی۔ اس میں سے ایک لفافہ مہکو کے حصے میں بھی آیا۔ سیٹھ کی سفارش پر مہکو کو خوش کرنے کے لیے بی بی نے ایک پانچ روپے کا نوٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ کچھ کہنے کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ مہکو چپ چاپ گھر چلا آیا اور چادر تان کے سو گیا۔ یہی اس کی پرانی عادت تھی۔ وہ جب بھی غمگین ہوتا یا کسی گہری فکر میں ہوتا تو سیدھا بستر پر چادر تان کے پڑا رہتا اور پھر گھنٹوں پڑا سوچتا رہتا۔ سوچتے سوچتے وہیں سو جاتا۔ دوسرے دن جب

Scanned by CamScanner

وہ اٹھتا، ہلکا پھلکا کام میں لگ جاتا۔ کل کی فکر نیند میں گھل مل کر سپنوں کے ساتھ اڑ جاتی۔

لیکن آج تو اس کا دماغ جیسے سلگ رہا تھا۔ پچھلے کئی ہفتوں میں وہ سائیکل کی شرط بالکل بھول گیا تھا اور جھبا نے بھی کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ یہاں تک کہ محلے کے کچھ دھوبی جنہیں اس شرط کا علم تھا وہ بھی بھول گئے تھے۔ لیکن آج اچانک جھبا نے اس کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی۔ وہ سٹپٹا گیا۔ ہودی پہ کپڑے دھوتے ہوئے آج جس نگاہ سے جھبا نے اس کی طرف دیکھا تھا وہ کبھی نہیں بھول سکتا۔ اس کے بس میں ہوتا تو صابن کی ڈلیاں مار مار کر اس کی آنکھیں پھوڑ دیتا۔

مہکو نے بیتابی سے دو تین کروٹیں بدلیں۔ چادر کو اور کھینچا تانا۔ سر کو گھٹنوں میں دبا کر وہ بالکل جلیبی ہو گیا۔

لیکن نیند آج کہاں؟ وہ جھبا سے ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی کر گزرے گا لیکن جھبا سے ہار نہیں مانے گا۔ جھبا... آ... آ جیسے وہ اس نام کی جگالی کر کے تھوک دینا چاہتا ہو!

صبح گزر گئی۔ دوپہر بیت گئی، لیکن وہ بستر سے نہیں اٹھا۔ شام کو بھی دیر گئے جب دھندلکا بڑھنے لگا۔ وہ برآمدے سے اٹھا اور اندر کوٹھری میں چلا گیا۔ اندر سے دروازہ بند کر کے وہ بیوی کے ٹرنک میں کچھ ڈھونڈتا رہا۔ بہت سے کپڑے اوپر نیچے کرنے کے بعد اسے بیوی کے گلے کی ہنسلی مل گئی۔ ہنسلی کو انٹی میں دبا وہ باہر نکل آیا۔

جھبا کے دروازے کے سامنے اس کی سائیکل اپنے اسٹینڈ پر کھڑی تھی۔ ایک منٹ کو ایسا لگا جیسے پچھی کسی میم کی اونچی سینڈل پہنے کمر پر ہاتھ رکھے سامنے کھڑی اس کا منہ چڑا رہی ہے۔ وہ لپک کے اندر گیا اور ایک نوکیلا چاقو لا کر سائیکل کے پہیوں میں اتار دیا۔ ایک پل میں سائیکل کے دونوں پہیے بیٹھ گئے۔

چاقو چارپائی پر پھینک ہنسلی کو انٹی میں دبا مہکو باہر چلا گیا۔

اور دوسرے دن بات سارے محلے میں پھیل گئی کہ مہکو کے پنجابی سیٹھ نے اسے سائیکل انعام میں دی ہے!

Scanned by CamScanner

زندہ

''میرے لیے کسی کو رونے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے دکھ میرے اپنے ہیں۔ ان پر روؤں یا ہنسوں!'' سمیر کی خاموشی ہی سمیر کی خودی تھی۔ گیارہ سال کی عمر میں جب سمیر کا دایاں بازو کٹا، تب چیخی تو ماں، چلایا تو باپ۔ لیکن وہ چپ چاپ ان تمام چہروں کو دیکھتا رہا جو راجا صاحب کی اکلوتی اولاد سمیر سنگھ کی مزاج پرسی کو آتے تھے اور روتے تھے۔

''میرے لیے کوئی نہیں رویا۔'' بائیس سال کی عمر میں بائیں ہاتھ سے اس نے اپنی ڈائری کے صفحے پر لکھا... ''لوگ روتے تھے، میری ماں کے لیے، میرے پتا کی بدقسمتی کے لیے کہ ان کی اکلوتی اولاد کا ایک بازو کٹ گیا۔ بھگوان نے ایک ہی لڑکا دیا اور اس کا بھی ایک بازو...''

لیکن سمیر کے کسی کام میں فرق نہیں آیا۔ جس دن دائیں بازو کی پٹی کھلی اس کے دوسرے دن سے اس نے بائیں سے ایسے کام شروع کر دیا جیسے دایاں کبھی تھا ہی نہیں... لوگ اس لڑکے کے حوصلے پر حیران تھے۔ کیسے سب سہے جاتا، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں!

''میرے انگ مجھ سے ہیں۔ میں اپنے انگوں سے نہیں۔ میں ہوں، میں زندہ ہوں۔ کیا ہوا اگر میری ٹانگ سوکھتی جا رہی ہے۔ ابھی تو میں سینے پر رینگ سکتا ہوں۔''

بازو کے آپریشن کے کچھ سال بعد سمیر کے ساتھ ایک اور حادثہ ہوا تھا— اس وقت وہ بیس برس کا تھا۔ ہر روز باپ کے ساتھ گھوڑ سواری کے لیے جایا کرتا تھا۔ باپ کے ساتھ دوڑ لگاتا تھا۔ ایک دن گھوڑے سے ایسے گرا کہ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔

پھر ایک آپریشن ہوا۔ پتہ نہیں کس دھات کی پٹی لگا کر کمر باندھی ڈاکٹروں نے سمیر سنگھ چلنے پھرنے سے بھی گیا۔ پھر وہی لوگوں کا تانتا، وہی مزاج پرسی، سمیر سنگھ پھر چپ چاپ ان چہروں کو دیکھتا رہا— ''یہ لوگ کیوں روتے ہیں۔ میں مرا تو نہیں۔ پیروں سے چلنا کیا ضروری ہے؟ آدمی بغیر پیروں کے بھی تو سفر کرتا ہے۔''

سمیر بغیر پیروں کے چلتا رہا اور کام کرتا گیا۔ پڑھائی لکھائی کے لیے ماسٹر گھر پر آنے لگے اور جب سمیر کا جی ان ماسٹروں سے اوب گیا تب اس نے ماسٹر بند کر دیے۔ گھر میں لائبریری بڑھنے

Scanned by CamScanner

لگی۔ بایاں بازو ابھی زندہ تھا اس نے ڈائری لکھنی شروع کی۔ اس نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ صرف اپنے آپ سے بولتا رہا۔ اپنے آپ سے کہتا رہا۔ وہ اپنی خاموشی میں تمام تر آواز کے ساتھ زندہ رہا۔

سال ڈیڑھ ہی گزرا ہوگا کہ ایک نئے مرض نے ٹانگوں میں رینگنا شروع کر دیا۔ ڈاکٹروں کی آمد و رفت پھر سے شروع ہوگئی۔ کچھ کہتے تھے کہ ریڑھ کا آپریشن ٹھیک نہیں ہوا۔ کچھ کہتے تھے کوئی نئی بیماری ہے جس کے سبب ٹانگوں تک خون پہنچنے میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ انہی دنوں سمیر نے لکھا تھا ڈائری میں...

''تو کیا ہوا؟ ابھی تو سینے پر رینگ سکتا ہوں۔ اپنی آواز پر چل سکتا ہوں۔ اپنی خاموشی کے ساتھ برسوں لمبا سفر طے کر سکتا ہوں۔''

لیکن اس کے بعد راجا صاحب کی حالت بہت غیر ہوگئی۔ دن رات سمیر کے غم میں بورائے سے رہنے لگے۔ کوئی وید، کوئی ڈاکٹر نہیں چھوٹا۔ کوئی پیر کوئی فقیر نہیں بچا۔ ماں دونوں کی حالت سنبھالتے سنبھالتے چل بسی... راجا صاحب پاگلوں کی طرح سمیر کے گرد گھومنے لگے۔ اس کے لیے دوست ڈھونڈتے تھے۔ ساتھی ڈھونڈتے تھے لیکن سمیر تو صرف اپنے آپ میں زندہ تھا۔ اپنی ایک چپ میں، اپنی ایک خودی میں! اچانک راجا صاحب نے ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ وہ سمیر کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ لڑکی ذات پات سے کچھ بھی ہو، کیسی بھی ہو، لیکن وہ ہو جو سمیر کی ہمدرد ہو سکے۔ زندگی بھر اس کا ساتھ دے سکے۔ سمیر نے سمجھایا، منع کیا۔ لیکن باپ کی حالت دیکھ کر چپ ہو رہا۔ جانتا تھا اس کے پتا کا غم اس کے زخموں سے بہت بڑا ہے۔

لڑکیاں بہت آئیں... لیکن رشتہ کوئی نہیں آیا... سمیر نے لکھا...

''لوگ آتے ہیں راجا صاحب کے لیے... راجا صاحب کی حویلی کے لیے راجا صاحب کی دولت کے لیے۔ میرے لیے تو لوگ صرف رونے کا بہانہ کرتے ہیں۔''

مایوس ہوتے ہوئے راجا صاحب کو رشتہ مل گیا۔ لڑکی ذات کی اچھی تھی۔ چال کی بھلی۔ راجا صاحب دیکھتے ہی جان گئے کہ وہ دولت دیکھ کر نہیں، درد دیکھ کر دکھ سمجھ کر ہی شادی کر رہی ہے۔

شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ راجا صاحب نے راج پاٹھ سبھی کچھ نچھاور کر دیا— کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ منڈپ سجے، بینڈ بجے، آتش بازی سے چاند کو آگ لگ گئی اور صبح ہوتے ہوتے دلہن کی مانگ راکھ سے بھر گئی— سمیر نے خودکشی کر لی تھی... ڈائری میں لکھا تھا...

''لوگ مجھے دیکھ کر روتے رہتے، ترس کھاتے رہتے تو اچھا تھا۔ ان کے ترس کھانے سے میری خودی کو جلا ملتی تھی... لیکن اب کیا کروں؟ اب تو لوگ مجھ پر ہنسنے لگے ہیں!!!''

Scanned by CamScanner

ہاتھ پیلے کردو

ان دنوں مالتی جوان تھی۔

اور چار بنگلے کے پچھواڑے کی کھاڑی میں ایک بار دن میں پانی بھرتی تھی اور ایک بار رات میں۔ دن میں جب کھاڑی ہائی ٹائیڈ کے پانی سے بھر جاتی تو سپر ٹیکسٹائل ملز کی ایک وین کار بہت سے دھوبی اور کپڑوں کی گٹھریاں لاکر کنارے پر چھوڑ جاتی۔ دڑبے سے کھلی مرغیوں کی طرح دھوبی ساحل پر بکھر جاتے اور ڈرائیور رام ناتھ تین بار ہارن بجاتا، ایک خاص انداز میں۔

''پی پی پیں! پی پی پیں! پی پی پیں!''

کہتے ہیں بھگوان کرشن کی مرلی کی آواز سن کر رادھا ان تک پہنچنے کے لیے پاگل ہو اٹھتی تھی۔ لیکن یہ تو ان دنوں کی بات ہے جب بھگوان کرشن کے پاس کار نہیں تھی۔ ورنہ وہ بھی بانسری کی لمبی سادھنا سے بچ جاتے۔

''پی پی پیں! پی پی پیں! پی پی پیں!''

مالتی ماں سے کہتی ''ماں میں شیلا کے پاس جاؤں؟''

''یہ کیا پاگل پن ہے جہاں دوپہر ہوئی اور تو بھاگی شیلا کے پاس!''

''ماں... ں... ں...!''

''اچھا جا میرا سر مت کھا۔''

اور رادھا، مرلی کی تان میں لپٹی بل کھاتی اپنے مرلی دھر کے پاس پہنچ جاتی۔ رام ناتھ کار بھگاتا اور اسے جمنا تٹ سے دور ایک سنسان سڑک پر لے جاتا۔ مرغیاں پل بھر کو گردن اٹھا کے دیکھتیں، کڑکڑ کرتیں اور پھر کنارے پر بکھر جاتیں — ایک دھوبی کی نسیں تن جاتیں، دوسرا ریت پر چت گر پڑتا اور زور زور سے گانے لگتا — ''پینا پلانا بھلا گئی، اک شہر کی لونڈیا!''

مالتی رام ناتھ کی گود میں سر رکھے کار میں پڑی رہتی۔

''جانتے ہو کل تمہارا ہارن سن کر ماں نے کیا کہا؟''

Scanned by CamScanner

''کیا؟''

کہنے لگی... ''ڈیڑھ بج گیا۔ میں نے پوچھا کیسے، تو بولی، یہ پچھواڑے میں جو دھوبی آتے ہیں نا، روز ایک ڈیڑھ کے لگ بھگ آتے ہیں اور روز یہ گاڑی اسی طرح ہارن بجاتی ہے!''

رام ناتھ زور سے ہنس پڑا۔ کہنے لگا... ''ماں سے کہنا ایک دن ہارن کے بجائے بینڈ بجاتا آدھمکوں گا۔''

روز کی طرح رام ناتھ دو تین گھنٹے کے بعد مالتی کو واپس لے آتا۔ مرغیاں گردن اٹھا کے دیکھتیں، کڑکڑ کرتیں اور کام میں لگ جاتیں۔ مالتی گھر آتی۔ چولھا چوکا کرتی۔ باپو کھانا کھا چکتا تو حقہ گرم کر دیتی۔ ماں باپو کے پاؤں دبانے جا بیٹھتی۔ مالتی بستر پر لیٹتی، پھر سمندر کے چڑھنے کا انتظار کرنے لگتی۔

رات میں جب ہائی ٹائیڈ آتی تو کھاڑی پھر بھر جاتی۔ سمندر کی لہروں کا شور دھیرے دھیرے نزدیک آنے لگتا۔ لہریں اس کے اوپر سے پھلانگنے لگتیں۔ چارپائی پانی میں تیرنے لگتی۔ تیرتے تیرتے کئی سمندر پار کر جاتی اور کئی انجانے جزیروں کو چھو آتی۔ آنکھ کھلتی تو وہی چولھا چوکا، باپو، حقہ اور ماں، وہ بے من، بے مقصد اپنے کام میں لگی رہتی اور پھر سے ہائی ٹائڈ کا انتظار کرنے لگتی۔

''پی پی ہیں! پی پی ہیں! پی پی ہیں!''

''ماں میں شیلا کے پاس جاؤں؟''

''کیا پاگل پن ہے؟''

''ماں... ں... ں!''

اچھا جا...!''

رادھا بھاگتے بھاگتے پھر مرلی منوہر کی گود میں جا گرتی۔ ایک دن اسی طرح مالتی رام ناتھ کے پاس پہنچی تھی کہ پیچھے سے ایک چیختی ہوئی آواز نے اس کے کان چھید دیئے۔

''مالتی... ی...''

مالتی بھنور کی طرح چکرا کے رام سے الگ ہوگئی۔ سامنے ماں کھڑی تھیں — چوٹی سے پکڑا اور گھسیٹتی ہوئی گھر لے آئی۔

رام ناتھ بت بنا بیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔

اس رات مالتی جب بستر پر جا کر لیٹی تو بہت روئی۔ ماں باپو کے گھٹنے سے لگی دیر تک کھسر پھسر کرتی رہی۔ مالتی نے صرف ایک ہی جملہ سنا — ''بیٹی جوان ہوگئی ہے۔ کوئی اچھا گھر دیکھ کے اس

Scanned by CamScanner

کے ہاتھ پیلے کردو۔"

ہر ماں یہی کہتی ہے — ہر باپ یہی کہتا ہے — یہ ایک جملہ بار بار اس کے کانوں میں گونجتا رہا۔ وہ تکیے میں منہ دیئے رات بھر سسکتی رہی۔

اس رات چار بنگلے میں ایک اور حادثہ ہوا۔ رات کے اندھیرے میں ایک چور چار بنگلے کی دیوار پھاند کر محلے میں گھس رہا تھا کہ چوکیدار نے دیکھ لیا۔ لوگوں نے پکڑا، خوب پیٹا اور جب مار مار کے تھک گئے تو پولیس کے حوالے کر آئے۔ دو دن بعد وہ شخص پولیس اسٹیشن میں ہی مر گیا اور پولیس نے سارے معمے پر پردہ ڈال دیا۔ جو لوگ پولیس اسٹیشن گئے تھے ان کا کہنا ہے کہ وہ رام ناتھ ڈرائیور ہی تھا جو مالتی سے ملنے آیا تھا۔

بہتے پانی میں بہت طاقت ہے۔ بہتا پانی کناروں کی روپ ریکھا بدل دیتا ہے۔ دریاؤں کے راستے بدل جاتے ہیں۔ سمندروں کے جزیرے نئی نئی شکلیں اختیار کر لیتے ہیں... چار بنگلے کے پیچھے کی کھاڑی بھی اب پیچھے کی دیوار سے بہت دور ہٹ گئی ہے۔ چار بنگلے کے بہت سے رہنے والے بدل گئے ہیں — پاس پڑوس بدل گیا ہے۔ لیکن مالتی اب بھی اسی محلے میں رہتی ہے... اپنے تین بچوں کے ساتھ، بڑی لڑکی لتا، چھوٹی لیلا اور چھوٹا لڑکا راجو — اس کی کنپٹیوں پر ابھی سے سفید بال آنے لگے ہیں۔

سپر ٹیکسٹائل ملز، مدت ہوئی بند ہو چکی ہے۔ لیکن اب بھی جب پچھواڑے کی کھاڑی پانی سے بھر جاتی تو کسی ٹیکسٹائل کا ٹرک وہاں آ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ چپ چاپ! اداس سا۔ جیسے اس کی عمر بھی ڈھل گئی ہو — اور دھوبی ایک ایک گٹھری لیے سارے ساحل پر بکھر جاتے ہیں۔

مالتی کا باپو اب اس دنیا میں نہیں ہے اور ماں بھی اپنے گنے چنے دن پورے کر رہی ہے۔ مالتی کا پتی بشن داس گھر میں بیٹھا ہونٹوں کے کونوں میں بیڑی دبائے کپڑوں پر زری کا کام کرتا رہتا ہے۔ بشن داس جب کام کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو بڑے پیار سے آواز دیتا ہے... لتا بیٹے!"

"نگوڑی دن بھر سوتی رہتی ہے، جیسے اسکول میں ہل جوتنے پڑتے ہوں!" مالتی کی زبان اپنی ماں کی سی ہو گئی ہے۔

"ارے تو غصہ کیوں کرتی ہے۔ بچے ہمیشہ روتے سوتے میں بڑھتے ہیں، لتا بیٹے!"

"آئی بابا!"

"بیٹا ذرا ایک کپ چائے تو بنا دے!"

لتا آنکھیں ملتی رسوئی میں چلی جاتی ہے اور چائے بنا لاتی ہے۔

Scanned by CamScanner

لتا بہت سمجھ دار لڑکی ہے۔ بشن داس اور مالتی دونوں کو بہت فخر ہے اس پر۔ ہاں چار بنگلے والوں نے ایک بار ضرور افواہ اڑائی تھی کہ وہ اسکول سے آتے جاتے نکڑ والے بنئے کے لڑکے سے ملا کرتی ہے لیکن مالتی نے محلے والوں کو ایسی کھری کھری سنائی تھی کہ پھر کسی نے چوں نہیں کی۔ مالتی کو پورا بھروسہ تھا کہ اس کی لڑکی کسی پرائے لڑکے کی طرف آنکھ اٹھا کے دیکھ بھی نہیں سکتی، ملنا تو دور کی بات رہی۔

''پی پی بیبیں! پی پی بیبیں! پی پی بیبیں!'' اچانک کھانا پروستے پروستے مالتی کے ہاتھ رک گئے۔ پل میں ایک زمانہ جیسے اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم گیا۔ سانس رک گئی اور آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

''کیا ہوا؟'' بشن داس کی آواز جیسے خلا میں گونج گئی۔

مالتی کچھ دیر اسی طرح باہر دیکھتی رہی۔ ہارن پھر بجا۔

''پی پی بیبیں! پی پی بیبیں! پی پی بیبیں!''

مالتی مڑی دوڑ کے اندر کمرے میں گئی اور دیکھا لتا میٹھی نیند اپنی چارپائی پر سو رہی تھی۔

مالتی کی سانس واپس آ گئی۔

''کیا ہوا؟'' بشن نے پھر پوچھا۔

''کچھ نہیں!'' وہ کھانا پروستے ہوئے بولی... ''کچھ نہیں۔ یوں ہی سوچ رہی تھی کہ بیٹی جوان ہو گئی ہے۔ کوئی اچھا گھر دیکھ کر اس کے ہاتھ پیلے کر دو۔''

Scanned by CamScanner

کاغذ کی ٹوپی

چھوٹا تھا، تب میں عقل سے کم، پر شکل سے زیادہ بے وقوف لگتا تھا اور منّی عقل سے تو اچھی تھی شکل سے بہت زیادہ اچھی لگتی تھی۔ مجھے ہی نہیں سب کو۔ اس لیے محلے کے بچے جب بھی شادی رچاتے تو دلہن ہمیشہ منّی ہوتی اور دولہا کوئی بھی۔ دولہا سہرا لگا کر اسے لینے آتا ہمکتا ہوا جیسے گھوڑی پر سوار ہو! براتیوں میں روٹی کے ٹکڑے اور چینی بانٹی جاتی۔ پھر آگے آگے دولہا گاتا ہوا چلتا...

''میں تو دلی سے دلہن لایا رے، ہے بابو جی'' اور پیچھے پیچھے دلہن چینی پھانکتی دولہا کے ساتھ چلی جاتی۔

ایک دفعہ میں نے منّی سے درخواست کی... ''منّی، اس دفعہ مجھے اپنا دولہا بنا!''... لیکن اس نے فوراً پھنکار دیا۔ ''جا جا... جا کے شیشے میں شکل دیکھ اپنی!''

اس دن گھر آ کر میں دیر تک اپنی شکل دیکھتا رہا اور نہ جانے کیوں مجھے یقین سا ہو گیا کہ میری شکل دولہا بننے کے قابل نہیں۔ شکل سے جھنڈو لگتا ہوں۔

منّی ہمارے قریبی رشتہ داروں میں سے تھی۔ روز ہمارے ساتھ کھیلتی تھی۔ وہ اپنے نئے نئے کھلونے ہمیں دکھاتی اور میں اسے اپنا خزانہ دکھاتا۔ قسم قسم کی بلور کی گولیاں، سوڈے کی بوتلوں کے ڈھکن، رنگ برنگے شیشوں کے ٹکڑے۔ اسے لال رنگ بہت پسند تھا۔ میں نے اپنے خزانے سے لال رنگ کے شیشے نکال کر اسے دے دیے۔ پھر منّی کے لیے کئی دن تک لال شیشے ڈھونڈتا رہا۔ لیکن جب لال شیشے کا کوئی ٹکڑا نہ ملا تو میں نے بابو جی کی میز پر پڑا ہوا پھولدان توڑ دیا...

دوسرے دن منّی سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور منّی نے میرے دیے ہوئے سارے شیشے باہر پھینک دیے... بہت دکھ ہوا مجھے۔ میں کلو کو ساتھ لے کر سیڑھیوں میں جا بیٹھا اور ساری داستان اس سے کہہ ڈالی... میرا خیال تھا وہ منّی کو برا بھلا کہے گا اور مجھ سے کچھ ہمدردی ظاہر کرے گا۔ لیکن وہ تو بیٹھا بس اپنی بہتی ہوئی ناک کے کرتب دکھاتا رہا۔ میری بات شاید اس نے سنی بھی نہیں! منّی کے خلاف تو کبھی کوئی بولتا ہی نہیں تھا!

Scanned by CamScanner

گھر میں بھی دونوں بھائی منی کے ساتھ کھیلتے رہتے اور مجھے الگ کر دیتے۔ میں الگ بیٹھا، پرانے اخباروں سے کھلونے بناتا رہتا۔ کبھی کشتی، کبھی ٹوپی، کبھی ہوائی جہاز! یہ کاغذ کے کھلونے بڑے مقبول ہوئے۔ محلے کے لڑکوں میں میری اہمیت بڑھ گئی — پھر منی بھی مان گئی کہ کاغذ کی اونچی ٹوپی لگانے سے میں دولہا جیسا لگتا ہوں — اور میں دولہا بن گیا!

ایک دن بیٹھا میں پتنگ بنا رہا تھا کہ نیرج آیا۔ اس نے میری طرف گھور کے دیکھا۔ میں کچھ ڈر سا گیا۔ ''نیرج بھیا یہ لو تمہارے لیے میں نے پتنگ بنائی ہے۔''

نیرج نے جھپٹ کر میرے ہاتھ سے پتنگ لی اور فوراً ٹکڑے کر کے بھاگ گیا۔ غصے سے میرا سارا بدن ابل پڑا۔ لیکن ضبط کر گیا۔ جانتا تھا وہ مجھ سے تگڑا ہے۔ زور سے ہاتھ جھٹک دے تو ہڈی چٹخ جائے۔ پتلا دبلا تو تھا ہی میں۔

شام کو جب ماسٹر جی پڑھانے آئے تو وہ اسے گلی سے ہی پکڑ لائے...

''سوال نکالے ہیں تم نے؟''

''جی ہاں!''... نیرج رعب دار آواز سے بولا۔

''انگریزی کا ترجمہ کیا ہے؟''

''جی! جی ہاں!''

''لاؤ سوال دکھاؤ۔''

میں خوش تھا اب اپنے کیے کی بھرے گا۔ لیکن اچانک اس نے میری سوالوں کی کاپی اٹھائی اور ماسٹر جی کے سامنے رکھ دی۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا نیرج نے اتنے زور سے میرا ہاتھ دبایا کہ میں سہم کے چپ ہو گیا۔

وقت لڑھکتا گیا اور بیس سال پھسل گئے۔ میں بمبئی آ گیا۔

منّی کے بڑے بھائی پرکاش نے جوہو کے ساحل پر ایک بڑا سا بنگلہ کرائے پر لے رکھا ہے۔ میں اس کے ساتھ ہی رہتا ہوں — باقی سب دہرہ دون میں تھے۔ منی بھی وہیں پڑھتی تھی۔ ابھی دو مہینے ہوئے کہ پرکاش کی شادی پر سب لوگ یہاں آئے — منی بھی آئی۔ جب آئی تو بہت بڑی بڑی لگتی تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ چھوٹی ہوتی گئی اور کچھ ہی دنوں میں وہ بچپن والی منی بن گئی۔ جس میں شوخی تھی۔ شرارت تھی۔ جب تک وہ تکلف میں رہی، میں سکھی رہا۔ لیکن جوں ہی وہ بے تکلف ہوئی میری شامت آ گئی — میں کمرے میں بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا کہ آپ آ گئیں۔ مجھے کرسی سے اٹھایا اور پکڑ کر باہر لے آئیں۔ دور ساحل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑے رومانی انداز میں بولیں...

Scanned by CamScanner

''وہاں دور ساحل پر چلیں۔''

''کیوں؟''

''چاٹ کھانے!''

ہر شام وہ چاٹ کے لیے ضد کرتی اور ہر صبح سمندر میں نہانے کے لیے۔ ہم سمندر میں نہانے گئے۔ نہاتے ہوئے اچانک اسے غوطہ آ گیا۔ ناک سے پانی نکلا اور جوں ہی وہ ذرا سنبھلی، پانی اچھالتی ہوئی، کنارے کی طرف بھاگ گئی۔

''اخ تھو... آخ خ خ تھو'' سمندری نمکین پانی اس کے حلق میں چلا گیا تھا۔ آخ خ خ خ... کرتے ہوئے گلا صاف کیا ہی تھا کہ میں نے زور سے ''تھو'' کر دیا۔ اس کا سارا غصہ مجھ پر منتقل ہو گیا۔ اس دن اس نے میری چائے میں نمک بھر دیا..... اور جب وہی پیالہ میں نے جان کرامی کو دے دیا تو وہ ان کے ہاتھ سے پیالہ چھین کر فوراً بھاگ گئی۔ امی کچھ نہ سمجھیں کہ کیا ہو رہا ہے — اور سچ پوچھو تو میں بھی اب سمجھا ہوں جب سب کچھ ہو گیا ہے —

دوپہر کے وقت میں میز پر بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ جب اس نے اندر جھانک کر دیکھا... ''اے مسٹر کیا ہو رہا ہے؟'' اس کے ہاتھ میں آئس کریم تھی۔ ''اے مسٹر!'' میں نے دیکھا اس کی طرف — ''کیا لکھ رہے ہو؟'' میں مسکرا کے پھر چپ ہو گیا۔

''سنتے ہو کہ نہیں؟'' وہ چلا کے بولی اور آئس کریم مین میرے کاغذ پر پھینک دی... میں غصہ میں کرسی سے اٹھا۔ لیکن وہ جا چکی تھی۔ کبھی اچھے موڈ میں ہوتی تو میرے کمرے میں آ جاتی۔ اپنے کالج کے لطیفے اور سہیلیوں کے واقعات سناتی رہتی... ''اور میری ایک سہیلی ہے۔ اسے ایک لڑکا ہر روز ہوسٹل میں ملنے آیا کرتا تھا... ایک دن کیا ہوا...''

''وہ لڑکا تمہاری سہیلی سے کیوں ملنے آتا تھا؟''

''مجھے کیا معلوم! وہ دونوں — پتہ نہیں!'' وہ گول کر جاتی۔

''تم نے اپنی سہیلی سے پوچھا کیوں نہیں؟''

وہ چڑ کے بولی... ''بات تو پوری سنتے نہیں۔ بیچ میں ٹانگ اڑا دیتے ہو۔'' وہ پیر پٹختی ہوئی واپس چلی جاتی۔

میرا جی چاہتا کہ وہ میرے ہاتھ سے قلم چھین لیتی، میرے سامنے سے کتاب اٹھا لیتی اور اپنے مخصوص انداز میں ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ جاتی۔ اپنی ٹھوڑی کو اپنی ہتھیلیوں پر ٹیکتی اور بڑے ناصحانہ انداز میں کہتی... ''جب تمہیں لکھنا نہیں تو کیوں کاغذ کالے کرتے رہتے ہو؟''

Scanned by CamScanner

اور پھر گھر سے ایک دن چٹھی آئی کہ نیرج بمبئی آ رہا ہے۔

نیرج آیا تو گھر میں ایک نئی رونق آ گئی۔ ہر وقت اچھل کود گانا بجانا کچھ نہ کچھ لگا ہی رہتا... فوج میں رہ کر رہی سہی سنجیدگی بھی اس کے مزاج سے نکل گئی تھی۔ سبھی اس کے غل غپاڑے میں شریک ہو جاتے اور پھر وہ اودھم مچتا کہ بس! نیرج کو نئے نئے پروگرام سوجھتے اور منی ان سب میں پیش پیش ہوتی...

نیرج کے ساتھ اس کا وقت خوب گزرنے لگا۔ نیرج کے آنے سے منی میری موجودگی سے بے نیاز ہوتی جا رہی تھی۔ میں اپنا زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنے لگا۔

ایک دن دوپہر کو میں گھر آیا تو دیکھا، منی نے نیرج کی فوجی وردی پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں سگریٹ تھا اور زور زور سے کھانس رہی تھی۔ جیسے دھواں حلق میں اٹک گیا ہو۔ میں الٹے پاؤں لوٹ گیا—

اس کے دوسرے چوتھے روز کی بات ہے وہ میرے کمرے میں آئی۔ غصے میں بھری ہوئی تھی۔ آتے ہی کہنے لگی... ''میرے فوٹو مجھے دے دو!''

''میں نے تو ان کا اچار ڈال دیا...'' میں نے ہنس کے کہا۔

''دو نا... تمہیں کیا حق ہے میرے فوٹو رکھنے کا؟''

میں نے چپ چاپ اٹھ کر تمام فوٹو نکال دیئے...

''اور وہ سمندر پر نہانے والے، وہ کہاں ہیں؟''

''معلوم نہیں نکال دوں گا۔''

''مجھے ابھی چاہئیں۔''

''نہیں ہیں میرے پاس!''

اس نے غصے میں سارے فوٹو میز پر پٹخ دیئے۔ میں نے دونوں ہاتھوں میں فوٹو اٹھائے، پھاڑے اور کھڑکی سے باہر پھینک دیئے۔ وہ کھڑی دیکھتی رہی... اور پھر چپ چاپ باہر چلی گئی...

اس کے بعد ہم نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ وہ بھی ناراض تھی۔ میں بھی غصے میں تھا... نیرج کی ضرورت سے زیادہ باتوں نے ہماری خاموشی کسی کو محسوس نہیں ہونے دی...

شام کو جب میں واپس آتا تو وہ برآمدے میں بیٹھی نیرج کے ساتھ تاش کھیل رہی ہوتی یا بھابھی کے ساتھ کیرم بورڈ جمائے ہوتی... چاٹ کھانا شاید اس نے اچانک ہی بند کر دیا تھا...

ایک رات میں دیر سے لوٹا۔ کمرے میں داخل ہوا تو منی میری میز پر بیٹھی شاید اخبار پڑھ رہی

Scanned by CamScanner

تھی۔ میرے قدموں کی آہٹ سنی تو فوراً کرسی سے کھڑی ہوگئی اور شیلف میں کوئی کتاب ڈھونڈنے لگی۔ میں اس کی طرف پیٹھ کئے الماری میں کپڑے ٹانگ رہا تھا کہ بولی... ''کل ہم واپس جا رہے ہیں۔''

''بڑی خوشی کی بات ہے۔'' میرے الفاظ جیسے فرش پر گر کے بج اٹھے۔ وہ کچھ دیر چپ رہی جیسے اسے برا لگا ہو۔ سچ پوچھو تو مجھے خود نہیں معلوم کہ میں نے وہ الفاظ کیوں کہہ دیئے—

''امی کہہ رہی تھیں... کل ہمیں ضرور چلے جانا ہوگا۔''

میں نے پوچھا ''تو تمہارا کیا ارادہ ہے؟''

کچھ دیر پھر خاموش رہی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ چہرے کا رنگ جیسے بالکل اڑ گیا تھا۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی ''تم ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟''

مجھے لگا جیسے وہ ابھی پھوٹ کے رو پڑے گی۔ میں اسے تسلی دینے کے ارادے سے آگے بڑھا تو وہ یوں دروازے کی طرف بڑھی جیسے پیچھے کچھ چھپا رکھا ہو۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا لیکن وہ بھاگ گئی۔ اس کے ہاتھ کا کاغذ میرے پاس رہ گیا۔ میں نے دیکھا اس نے اخبار سے کاغذ کی ٹوپی بنا رکھی تھی۔

Scanned by CamScanner

حساب کتاب

بابو دینا ناتھ نے اپنے بیٹے سروِن کمار کی شادی ماسٹر رام کمار کی بیٹی اوشا سے طے کر دی!

ماسٹر رام کمار بڑے خوش تھے۔ پڑھا لکھا کر بیٹی کو بی۔ اے کرا دیا تھا۔ اونچی تعلیم دی تھی اور سب سے بڑی بات کہ جب اوشا نے نوکری کرنی چاہی تو انہیں رتی بھر بھی اعتراض نہیں ہوا۔ فوراً اجازت دے دی۔ فکر تھی تو صرف اتنی کہ کل کوئی ورا اپنے آپ چن کر نہ لے آئے۔ آخر تھی تو بچی ہی۔ قدبت نکلنے سے ہی بچے سمجھدار تو نہیں ہو جاتے۔ لیکن اوشا نے اس طرح کی کسی شکایت کا کوئی موقع نہیں دیا بلکہ دو ایک بار جب اس کے رشتے کی بات چلی تھی تو اس نے گردن جھکا کے بڑے ادب سے کہہ دیا... ''آپ میرے لیے جو سوچیں گے میرے سر آنکھوں پر۔''

اوشا کو نوکری کرتے تین چار سال ہو چکے تھے۔ گھر کا بوجھ تو اس نے سنبھال رکھا تھا۔ لیکن اس کا بوجھ ماسٹر رام کمار پر آہستہ آہستہ بھاری ہونے لگا تھا... اوشا کے رشتے کی بات کئی جگہ چلی اور ٹوٹ گئی۔ ہر جگہ ان کی بیٹی کے دام لگ جاتے تھے۔ کوئی پچاس ہزار کا دیج مانگتا تو کوئی لاکھ کا۔ جنہیں نقد روپے کی ضرورت نہیں تھی وہ بیٹے کے نام اسکوٹر یا کار مانگ لیتے تھے۔

''ہاں سونا زیور دینا تو آشیرواد کی بات ہے اور پھر آپ کی بیٹی ہی تو پہنے گی۔ دیر سویر اسی کے کام آئے گا۔ سچ کہیے تو ماسٹر جی اچھا برا وقت کس پر نہیں آتا۔ اس وقت ماں باپ کا دیا آشیرواد ہی تو کام آتا ہے۔''

ماسٹر رام کمار کی سوچ کو دیمک لگ گئی۔ یہی ادھیڑ بن کھانے لگی انہیں۔ پانچ دس ہزار کی بات ہوتی تو کہیں سے مانگ تانگ کر کال ٹال دیتے۔ لیکن اتنا دیج دینا ان کے بس کی بات نہیں تھی... انہوں نے جو کمایا تھا وہ سب تو اوشا کی پڑھائی لکھائی میں صرف کر دیا۔ بیچ بچا کے یہ چھوٹا سا گھر تھا جس میں وہ رہتے تھے۔ چھوڑ دیں تو پگڑی مل جائے۔ لیکن پگڑی لے لیں تو سر کہاں چھپائیں۔

اچانک دینا ناتھ مل گئے...

دینا ناتھ کی بورڈ رنگنے اور لکھنے کی چھوٹی سی دکان تھی۔ لیکن بیوپار اچھا خاصا چلتا تھا۔ آج کل

Scanned by CamScanner

آئے دن راستوں کے نام بدلتے رہتے تھے۔ میونسپل کمیٹی میں اچھی خاصی ساکھ تھی۔ ان کی تھوڑی سی مٹھی گرم کرنے سے آرڈر مل جایا کرتے تھے۔ نئے نام نہ آرہے ہوں تو پرانے ناموں کو میلا ہونے میں کتنا وقت لگتا ہے بھلا؟ دکانوں مکانوں کے نام نمبر بھی کم نہ تھے۔ چار پانچ کاریگر کام کرتے تھے اور سروں کمار، اکلوتا بیٹا ان کا، بیوپار سنبھالتا بھی خوب تھا۔ مجال نہیں کبھی کسی انگریزی لفظ کے ہجے غلط ہو جائیں اور اب تو اس نے انگریزی، ہندی کی ڈکشنری بھی دوکان پر رکھ چھوڑی تھی۔

ماسٹر رام کمار اپنے اسکول کے لیے ایک بورڈ لکھوانے آئے تھے اور دینا ناتھ سے ملاقات ہوگئی۔ لفظوں کی بناوٹ وہ چاک سے لکھوا کر لائے تھے جو بہت خوبصورت تھی۔ دینا ناتھ نے پوچھا تھا، وہ کس کی لکھائی ہے...

''میری بیٹی نے لکھ کر دیا ہے۔ اسکول میں ڈرائنگ کیا کرتی تھی۔''

''اچھا؟... اب کیا کرتی ہے؟ پڑھتی ہے؟''

''گریجویٹ ہے! سروس کرتی ہے!''

''اچھا اچھا!... بہت اچھا۔''

جب بورڈ لینے گئے تو بہت دیر تک بات چیت ہوئی۔ دینا ناتھ کے خیالات سے ماسٹر رام کمار بہت خوش تھے۔

''میں تو صاحب سراسر لڑکیوں کے کام کرنے کے حق میں ہوں۔ رسوئی سے نکل کر انہیں باہر کی دنیا دیکھنی چاہیے۔ خود اپنے پیروں پر، میں تو کہتا ہوں، کھڑا ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ چلنا اور دوڑنا بھی چاہیے۔ اب یہی دیکھئے نا سروں کی ماں اگر گھر سے یہاں دکان پر آنا چاہیں تو ہم میں سے کسی ایک کو لینے جانا پڑتا ہے۔ ڈبل کرایہ خرچ ہوتا ہے۔ کیسی بچھڑی ہوئی بات لگتی ہے ماسٹر... ماسٹر رام کمار جی!''

دونوں میں جم گئی!

ایک دن دینا ناتھ، ماسٹر رام کمار کے ہاں چائے پینے گئے... اوشا سے بھی ملاقات ہوئی۔

پھر ایک دن ماسٹر رام کمار، دینا ناتھ کے ہاں کھانے پر آئے۔ اوشا بھی ساتھ تھی۔ دونوں پریوار مل کر بہت خوش ہوئے۔

اور پھر ایک دن...

بابو دینا ناتھ نے اپنے بیٹے سروں کمار کی شادی ماسٹر رام کمار کی بیٹی اوشا سے طے کر دی۔ دونوں بہت خوش تھے۔

Scanned by CamScanner

ماسٹر رام کمار اپنی بیٹی سے کہہ رہے تھے... ''بہت ہی اونچے خیالات ہیں بابو دیناناتھ کے — بتاؤ آج کے زمانے میں اور ملے، تو ملے ایسے سسر ملتے ہیں کہیں؟ کہنے لگے مجھے تو ایک دھیلے کا دہیج نہیں چاہیے۔ ساڑھے تین کپڑوں میں لڑکی بھیج دیجئے اور لڑکی آپ کی پوری آزادی کے ساتھ سروس کرتی رہے گی۔'' میں تو حیران ہوگیا۔ بولے... ''میری تو شرط ہے کہ اوشا اپنی سروس کے ساتھ ہی میرے گھر کی بہو بنے گی۔ مجھے رسوئی گھر کی باندی نہیں چاہیے۔''

اور دیناناتھ اپنی بیوی کو سمجھا رہے تھے... ''ناراض کیوں ہوتی ہو بھاگیوان! تمہارا لایا سونا کیا بچا؟ کچھ دکان بنانے میں اٹھ گیا، کچھ ٹیکس چکانے میں! ہم تو سانس لیتا سونا لائے ہیں دہیج میں... پنشن بندھ گئی۔ چودہ سو روپے تنخواہ کے لائے گی اور ڈرائنگ بھی اچھی ہے اس کی۔ بارہ سو روپے کا ایک ورکر کم ہوا دوکان پر! کیوں؟''

Scanned by CamScanner

آگ

آگ کھیلنے کی چیز نہیں ہے۔ چھیڑو تو کاٹ کھاتی ہے۔ ماس نوچ لیتی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ آگ جانور بھی ہے، پرندہ بھی ہے، پتنگا بھی! تتیئے کی طرح جہاں کاٹ لے وہاں چھوٹا سا پیلا سا چھالا پڑ جاتا ہے۔ آج سے کوئی پندرہ لاکھ سال پہلے کی بات ہے جب لوگ قبیلوں میں رہتے تھے۔ جنگلی جانوروں کے ڈر سے پیڑوں پر چڑھ کے سوتے تھے۔ غاروں میں چھپ کر بسر کرتے تھے۔ انسان اور جانور میں تب بہت کم فرق تھا۔ انسان جانوروں کا شکار کرتا تھا اور جانور انسانوں کا۔ جو جس کو پہلے مار لے۔ دونوں بڑے بڑے جھنڈ بنا کر جنگلوں میں گھوما کرتے تھے۔

ان دنوں ایک قبیلے میں ایک آدمی تھا جو کچھ اس طرح سوچتا تھا...

''یہ رات کیوں ہوتی ہے؟... یہ سورج کہاں چلا جاتا ہے؟ پہاڑ کے اس طرف اس کا گھر ہوگا! لیکن صبح کے وقت جب آتا ہے تو دوسری طرف سے کیوں آتا ہے؟ جس طرف سمندر ہے؟''

اس آدمی کا نام حابو تھا۔ وہ سوچتا... ''سورج ضرور سمندر میں نہانے جاتا ہوگا۔ لیکن جاتا کس راستے سے ہے؟... چھپ کے جاتا ہے! ضرور ننگا ہو کے جاتا ہوگا نا اسی لیے!... پتہ چل جائے تو ایک دن ضرور جا کر ملوں گا۔ اس کے پہننے کے لیے ایک کھال بھی لے کر جاؤں گا اور کہوں گا کہ پہاڑ کے اوپر ہی اپنا گھر بنا لے تا کہ ہمیں ہر وقت روشنی ملتی رہے۔''

انسان اور جانور میں سب سے بڑا فرق یہ تھا کہ انسان سوچ سکتا تھا اور جانور سوچ نہیں سکتا تھا۔ رات کو قبیلے کے ساتھ لیٹے لیٹے حابو آسمان کی طرف دیکھتا رہتا۔ دور بہت دور اسے ستارے نظر آتے۔ کبھی کبھی چاند بھی نظر آتا۔ چاندنی راتوں میں پھر بھی کچھ روشنی رہتی تھی جنگل میں۔ جنگلی درندوں سے بچنے کے لیے اتنی روشنی کافی تھی۔

''چاند شاید سورج کا چھوٹا بھائی ہے۔ یا بیٹا اس کا؟ اور ستارے اس کا کنبہ ہوں گے۔ ہماری طرح! اور سورج انکے قبیلے کا سردار۔'' اس نے سوچا اس کی ماں ضرور جانتی ہوگی انکے بارے میں۔

ماں نے کہا... ''باکھا سے پوچھو۔ وہ جانتا ہوگا۔''

Scanned by CamScanner

باکھا ان کے قبیلے کا سردار تھا۔ سب کے کھانے پینے کا خیال رکھتا تھا۔ ان کی حفاظت کا انتظام کرتا تھا۔ باکھا نے بتایا... ''وہ سب دیوتا ہیں۔ آسمان میں رہتے ہیں۔ ان کے بھی قبیلے ہیں ہماری طرح!''

''وہاں جنگلی جانور بھی رہتے ہیں یا نہیں؟''

''نہیں!''

''تو پھر کھاتے کیا ہیں؟''

''کچھ نہیں''

''ارے! تو مرتے نہیں؟''

''نہیں!''

ھابو سوچ سوچ کے تھک جاتا۔ ہزاروں سوال اس کے ذہن میں آتے تھے۔ سب تو یاد بھی نہ رہتے۔ کبھی کبھی وہ سوچتا...

بچے صرف عورتوں کے ہاں ہی کیوں پیدا ہوتے ہیں؟ مردوں کے ہاں کیوں نہیں ہوتے؟ وہ بھی ایک بچہ پیدا کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ اڑ سکتا تو پھر کسی جانور کا ڈر نہیں تھا۔ کوے کی طرح اڑ کر ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھ سکتا تھا۔ اس دن پیڑ پر چڑھ کر اس نے اڑنے کی کوشش کی تو بہت زور سے زمین پر گرا۔ اوپر سے باکھا نے ایسی حرکت کرنے پر ایک اور لات جمادی۔ اس کی چوٹ دیکھ کر سب ہنستے تھے۔ صرف اس کی ماں کو ہی تکلیف ہوتی تھی۔

ایک رات بہت بارش ہوئی۔ زمی نے ھابو سے پوچھا... ''اتنا پانی کہاں سے آتا ہے؟''

ھابو فوراً بول پڑا... ''آسمان پر دیوتاؤں کا قبیلہ رہتا ہے۔ کبھی کبھی وہ سب مل کر موتنے جاتے ہیں تو بارش ہوتی ہے۔''

زمی اتنا اچھا جواب سن کر حیران رہ گیا۔ بولا... ''ھابو ایک دن تو بھی بڑا ہو کر باکھا کی طرح قبیلے کا سردار بنے گا۔ کتنی جانکاری ہے تیرے پیٹ میں!'' وہ کہنا چاہتا تھا کتنا علم ہے تیرے اندر۔ اس وقت انسان یہی سوچتا تھا کہ عقل بھی پیٹ میں ہوتی ہے۔

ھابو کا علم عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا۔ اس کے ذہن میں جو سوال آئے تھے۔ اب وہ خود ہی ان کے جواب ڈھونڈنے لگا اور جب وہ اپنے علم اور گیان کی باتیں بتاتا تو لوگ حیران رہ جاتے۔ کبھی کبھی باکھا بھی!۔ بادلوں کے گرجنے کا راز بھی ھابو نے ہی بتایا۔ ''دیوتا جب آپس میں لڑتے ہیں تو اٹھا پٹخ میں جو ہڈیاں ٹوٹتی ہیں تو ایسی آواز ہوتی ہے۔'' ھابو نے جب سے سوال ڈھونڈنے

Scanned by CamScanner

کے بجائے جواب ڈھونڈنے شروع کیے تھے، اس کا بہت رعب بڑھنے لگا تھا اپنے قبیلے پر!

ھابو نے ہاتھی کی پیٹھ پر اکثر کوے کو اچکتے دیکھا تھا۔ نہ اس کے کان ہلانے سے اڑتا تھا، نہ سونڈھ سے، نہ چھوٹی سی پونچھ سے۔ ایک ہاتھی کو اس نے اکثر اکیلے گزرتے دیکھا تھا۔ وہ ہر روز سمندر کے کنارے تک جاتا تھا۔ پانی سے کھیلتا تھا اور پھر لوٹ جاتا تھا۔ زمین سے اوپر اٹھ کر چلنے کی بڑی خواہش تھی ھابو کی! بس ایک دن اس لیے جان کی بازی لگا دی۔ ایک پیڑ کی ڈال پر چڑھ کر بیٹھ گیا اور جیسے ہی وہ ہاتھی اس طرف سے گزرا وہ اس کی پیٹھ پر کود گیا۔ ہاتھی کے لیے یہ ایک نیا ہی تجربہ تھا وہ سٹپٹا گیا۔ پہلے تو گول گول گھوما۔ سونڈ سے پھنکارا، دم ہلائی اور جب کچھ نہ بن پایا تو جنگل کی طرف دوڑ لیا۔ ھابو کے تو مزے آ گئے اور ٹھیک ایک جگہ ایک پیڑ کی ڈال پکڑ کے کودا اور بھاگ گیا۔

دو تین روز کے بعد ھابو نے پھر وہی کیا۔ ہاتھی چنگھاڑتا بھاگتا اور ھابو ٹھیک اسی جگہ کود کر بھاگ جاتا۔ ایک روز ہاتھی نے ھابو کو سمندر میں دوستوں کے ساتھ نہاتے ہوئے پکڑ لیا۔ سونڈ بھر کے اس نے ھابو کے منہ پر پھنکار دیا۔ باقی لوگ تو ڈر کے بھاگ گئے اور ہاتھی نے ھابو کو سونڈ میں لپیٹ کر اوپر اٹھایا اور اپنی پیٹھ پر بٹھا دیا۔ اس سے پہلے کہ ھابو کو ہوش آتا اور وہ کود سکتا، ہاتھی کچھ اور گہرے پانی میں اتر گیا۔ ھابو بار بار چلاتا تھا اور ہاتھی سونڈ میں پانی بھر بھر کے اس کے اوپر پھینکتا تھا۔ ہاتھی کو بہت مزہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد ھابو نے چلانا بند کر دیا۔ بڑی دیر بعد اسے محسوس ہوا کہ ہاتھی اس سے لڑ نہیں رہا بلکہ کھیل رہا ہے۔ جب ہابو کے قبیلے والے سمندر کنارے پہنچے تو ھابو اور ہاتھی کو دوستوں کی طرح کھیلتے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔ ایک جنگلی جانور جس سے سب ڈرتے تھے۔ اسے ھابو نے پالتو کر لیا تھا۔ ھابو کی تو دھاک ہی بیٹھ گئی اور اس دن تو لوگوں کے حواس ہی گم ہو گئے جس دن وہ ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنے قبیلے کی طرف آیا۔ اس کے لوگ بھی ہاتھی سے ڈرے نہیں۔ اس کے پاس گئے، اسے کچھ کھانے کو دیا تو وہ سونڈ میں لپیٹ کر کھا گیا۔ تب سے وہ ہاتھی بھی اس قبیلے کا حصہ ہو گیا۔ ھابو نے جو کیا تھا، اس سے پہلے انسان کی نسل کے ذہن میں آیا ہی نہیں تھا کہ جنگلی جانور کو پالتو بھی بنایا جا سکتا ہے۔ پہلے پہلے انسان اور جانوروں میں یہی دوستی ہوئی تھی۔

انسان کو سردی اور گرمی کا احساس تو تھا۔ لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ گرمی کیوں لگتی ہے، ٹھنڈ سے وہ کیوں کپکپانے لگتا ہے۔ بارش سے بچنے کے لیے اس نے کچھ غار ضرور ڈھونڈ لیے تھے۔ لیکن ابھی تک اسے موسموں کے بدلنے کا علم نہیں ہوا تھا اور ابھی تو وقت ناپنا بھی نہیں سیکھا تھا انسان نے۔

Scanned by CamScanner

صرف دن اور رات کا اندازہ ہوا تھا۔ مہینے اور سالوں کا پتہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے کیسے جانتا کہ ایک موسم کتنا لمبا ہوتا ہے اور یہ کہ موسم ہر سال واپس آتے ہیں۔ وہ بس اتنا سمجھتا تھا کہ ایسی سردی پہلے بھی محسوس ہوئی تھی۔ ایسی برف پہلے بھی پڑی تھی اور بارش سے وہ پہلے بھی گزرا تھا۔ کتابیں تو تھیں نہیں اس لیے علم بھی ایک پشت سے دوسری پشت تک چلتا رہتا تھا۔

ایک سال سردیوں کے دنوں میں بڑی کڑاکے کی بجلی چمکی۔ حابو نے یہ پہلے بھی دیکھا تھا۔ جب بجلی چمکتی تھی تو کچھ دیر کے لیے بہت دور تک روشنی ہو جایا کرتی تھی۔ سب کچھ ایسے ہی نظر آتا تھا جیسے دن میں! لیکن اس سال اس رات کو جو بجلی کڑکی تو اتنے زور سے کہ جیسے کان پھٹ گئے اور پھر وہ روشنی ویسی کی ویسی ہی جنگل میں اتر آئی۔ کچھ دور ایک سوکھے سے پیڑ کی ڈالیاں ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گر رہی تھیں۔ وہ جانور بھی دھیرے دھیرے نیچے اتر رہا تھا۔ اس جانور کے بدن سے سورج کی طرح روشنی نکل رہی تھی۔ جس میں دور دور تک سب کچھ نظر آ رہا تھا۔ حابو کے قبیلے والے بھاگ کر اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ ایسا جانور کسی نے بھی پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ باکھا کی پچھلی پشتوں میں بھی نہیں۔ وہ "آگ" تھا...!

اس کا نام "آگ" کب پڑا، پتہ نہیں اور یہ نہیں پتہ کہ وہ "نر" سے "مادہ" کب ہوا۔ لیکن پہلے پہل وہ ایک نر جانور ہی سمجھا گیا۔

وہ پیڑ بہت بڑا تھا۔ اس کے پاس ایک دو پیڑ اور بھی تھے۔ جب لپٹیں ان کی طرف اڑتیں تو سارے قبیلے والے شور مچاتے۔ "دیکھو— وہ اس کو بھی پکڑ رہا ہے!"

اور ہوتے ہوتے جب وہ بھی آگ کی لپیٹ میں آ گئے تو وہ چھوٹا ہوتا ہوا جانور پھر سے بڑا ہو گیا۔ پہلا پیڑ اوپر سے بالکل غائب ہو چکا تھا۔ سب کی ایک ہی رائے تھی... "وہ کھا گیا!... وہ کھا گیا...!"

پیڑ کا پیڑ کھا جانے والا جانور انسان نے پہلی بار دیکھا تھا۔ رات بھر وہ جانور ان کے پیڑوں کو کھاتا رہا۔ صبح ہو گئی پھر بھی اس کا پیٹ نہیں بھرا۔ دوسرے جانور تو اپنا شکار کھا کر چلے جاتے تھے۔ لیکن یہ تو کہیں جاتا بھی نہیں تھا۔ شکار مار کر وہیں کا وہیں بیٹھا پیڑ کھا رہا تھا۔ کچھ اور پیڑ بھی تھے۔ کچھ دوری پر۔ حابو نے سوچا... "وہ پیڑ یا تو اسے نظر نہیں آئے یا اس کا پیٹ بھر گیا ہے۔"

اس نے باکھا سے پوچھا۔ باکھا نے بڑی اچھی رائے دی... "مجھے لگتا ہے یہ جانور سوکھے ہوئے پیڑ کھاتا ہے۔ لیکن اسے پہلے تو کبھی نہیں دیکھا جنگل میں۔" باکھا نے اپنی رائے میں تھوڑی سی ترمیم کی... "مجھے لگتا ہے کوئی پرندہ ہے، اوپر سے جا رہا ہوگا، سوکھا پیڑ دیکھ کر نیچے اتر آیا۔ لیکن

Scanned by CamScanner

اسے تو پہلے کبھی آسمان میں اڑتے ہوئے بھی کبھی نہیں دیکھا۔" تھوڑی سی مزید ترمیم کی باکھا نے...
"مجھے لگتا ہے کوئی آسمان کا جانور ہے۔ دیوتاؤں کے گھر سے گر پڑا۔ دیکھتے نہیں، اس کا رنگ بھی ویسا ہی ہے!"

اب باکھا کو خود بھی اپنی بات پر یقین آنے لگ گیا تھا۔ دوسروں کو بھی کچھ کچھ یقین آ گیا۔ جو سمجھ میں نہ آئے اسے خدا کا کرشمہ کہہ دینے کا دستور تو آج بھی ہے۔ لیکن اب ایک اور بات جو حابو کو حیران کر رہی تھی وہ یہ تھی کہ سب تو کھانے سے موٹے ہوتے ہیں اور یہ جانور اتنا کچھ کھانے کے بعد بھی چھوٹا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ جگہ کافی لال ہو گئی تھی۔ زمی کا کہنا تھا کہ شیر کی طرح وہ بھی کھا کے سو رہا ہے۔ ٹمبا کی بہت عادت تھی ہیکڑی جمانے کی۔ بولا... "سو رہا ہے تو میں جگاتا ہوں۔"

ٹمبا نے اسے ہاتھ سے چھو کے جگانے کی کوشش کی تو چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔ آگ نے اس کے ہاتھ پر زور سے کاٹ لیا۔

جلنے کا احساس تو اس سے پہلے کبھی تھا ہی نہیں۔ جلنے کا لفظ تو آگ کے بعد ہی پیدا ہوا۔ ٹمبا کے ہاتھ میں چھالے پڑ گئے۔ سب نے دیکھا اس کی بانہہ کے بال بھی غائب ہو گئے تھے۔

"وہی چاٹ گیا..." چھالا دیکھ کر زمی بولی...

"اس کے دانتوں کا نشان ہوگا۔"

"دانت تو نظر نہیں آتے۔"

"تو بال کیسے کاٹے؟"

"کاٹا!... لیکن خون تو نکلا نہیں۔"

ٹمبا ابھی تک چڑا ہوا تھا۔ لمبی سی ایک ڈالی توڑ کے وہ آگ کو چھیڑنے لگا۔ تھوڑی دیر تک تو آگ چپ رہا۔ جہاں پر ڈال اس کے پیٹ میں لگتی تھی وہاں وہاں وہ کالی ہوتی جا رہی تھی اور پھر اچانک اس پر لپٹ بھڑک اٹھی۔ گھبرا کے ٹمبا نے ڈال پھینکی تو کمر پر بندھی کھال اس میں رک گئی۔ کھال کے نیچے گرتے ہی آگ نے اسے پکڑ لیا۔ پھر سے ایک شور مچ گیا۔ ٹمبا ننگے کا ننگا رہ گیا۔ دیکھتے دیکھتے آگ نے کھال بھی کھالی اور ڈال بھی کھانے لگا۔

"یہ جانور تو پھر سے بڑا ہو گیا"... "زمی بولی... "یہ تو کچھ بھی کھا جاتا ہے!"

دو تین لوگوں نے اٹھا کے بڑے بڑے پتھر پھینکے اور انتظار کرتے رہے۔ لیکن آگ پتھر نہیں کھا سکا۔ حابو نے بتایا... "اس کے دانت نہیں ہیں اس لیے پتھر کالے ہو گئے لیکن اس سے توڑے نہیں گئے۔"

Scanned by CamScanner

ایک اور بات حابو کی سمجھ میں آئی۔ اس کے بہت سے منہ ہیں۔ یہ کئی طرف سے کھاتا ہے اور یہ کہ اس کے پیر نہیں ہیں۔ اس لیے خود چل کر اپنے کھانے کے پاس نہیں جا سکتا۔ جتنا دو، اتنا کھاتا رہتا ہے۔ کھانا ختم ہو تو یہ بھی ختم ہونے لگتا ہے۔

جب سے ہاتھی پالا تھا، حابو کو ایک شیر پالنے کا شوق لگا ہوا تھا۔ لیکن آگ کو دیکھ کر اس کا دل للچانے لگا۔ کیوں نہ اسی کو پال لے۔ آگ کو مرتے دیکھ کر حابو ادھر ادھر سے ٹہنیاں چن کر لے آیا اور اس پر ڈال دیں۔ ''آگ'' پھر سے بڑا ہو گیا۔ بس آگ کو پالنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اسے کھلاتے رہو۔ کھائے بغیر وہ مر جاتا ہے۔ اس نے اس رات اپنی ماں کو بتایا۔

ماں نے پوچھا... ''تو کیا کرے گا اسے پال کے؟''

''دیکھو نا اس کے زندہ رہنے سے روشنی رہتی ہے۔ رات کو بھی سب کچھ نظر آتا ہے اور تو اور جنگلی جانور بھی اس کے پاس نہیں جاتے۔ ڈر کے بھاگ جاتے ہیں۔ ہم اگر آگ کو پال لیں تو کوئی جانور ہمارے قبیلے پر حملہ نہیں کرے گا۔''

بات تو معقول تھی۔ باکھا نے بھی ہاں میں سر ہلا دیا۔ دراصل حابو کی سمجھ بوجھ کے سامنے لوگوں کی زبان نہیں چلتی تھی۔

حابو کے قبیلے والوں نے خوشی سے اس کی بات مان لی۔ ہر روز جہاں اپنا شکار کرتے، وہاں روز اس نئے جانور کا پیٹ بھرنے کے لیے ٹوٹی ہوئی سوکھی لکڑیاں اٹھا کر لاتے اور بڑے شوق سے پاس بیٹھ کر اسے کھلاتے رہتے۔ ان کا بہت جی چاہتا اسے ہاتھ سے چھو کر پیار کریں۔ لیکن جب بھی کوشش کی ان کے کاٹ لیا۔ حابو کی چرچا اب قبیلے کے باہر بھی ہونے لگی تھی۔ بہت سے اور قبیلے بھی آگ کو دیکھنے آئے اور پھر ایک دن ایک برا حادثہ ہوا...

بہت بارش ہوئی اور اس دن حابو کے سارے قبیلے نے بھی آنکھوں کے سامنے اس لال سنہرے جانور کو سی سی کرتے مرتے دیکھا۔ پہلی بار دھواں دیکھا تو انہیں لگا اس کی جان ہوگی جو اٹھ کر آسمان کی طرف جا رہی تھی۔ اب انہیں اور بھی یقین ہو گیا کہ وہ آسمان والے دیوتاؤں کے گھر سے آیا تھا۔ کچھ دیر بعد راکھ کا ایک ڈھیر رہ گیا۔ جسے وہ سمجھے ''آگ'' کا جسم تھا۔ ڈمی نے ایک عجیب بات کہی... ''اس کا مطلب ہے مر کے سب کی جان اوپر ہی جاتی ہوگی۔''

حابو نے پوچھا... ''نظر تو کبھی نہیں آتی؟''

ڈمی کو اس کا جواب نہیں معلوم تھا۔ لیکن یہ سوال ہمیشہ کے لیے انسانوں کے دماغ میں رہ گیا۔ لوگ ابھی تک اس کا جواب پوچھتے ہیں کہ مر کے انسان کی جان کہاں جاتی ہے؟

Scanned by CamScanner

جنگل نامہ

ترائی کے جنگل جہاں ختم ہوتے ہیں وہاں سے پرنا ندی بہتی ہوئی گذرتی ہے۔ یوں تو بہت شانت ہے۔ لیکن بارشوں میں چھپلانے لگتی ہے اور بے چینی میں دونوں کناروں پر ہاتھ پاؤں مارتی ہے۔ کبھی کبھی ادھر اُدھر کی مٹی بھی بہا کر لے جاتی ہے۔ ندی کے پرلی طرف ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے جس پر انسانوں کی بستی ہے۔ کسی زمانے میں وہاں بھی جنگل ہوا کرتے تھے۔ جہاں چیتے، بھالو سے لے کر بندر، چوہے، نیولے اور سانپ تک بھی رہتے تھے۔ اب صرف انسانوں کے غلام کتے رہتے ہیں یا کچھ ایسے جانور جو جنگل کی تہذیب چھوڑ کر انسانوں کے پالتو پٹھو بن گئے ہیں۔ گائے، بیل، بھینس، بکریاں اور گدھا تو خیر گدھا ہی ہے۔ لیکن سنا ہے کہ اس بستی کے بڑے چودھری کے یہاں گھوڑوں کے علاوہ ایک پالتو ہاتھی بھی ہے۔ جس کا نام مہابلی ہے اور تو اور گھوڑوں کو اس کے اپنے ذات بھائی گھوڑوں نے ہی پڑھا پڑھا کر پالتو بنایا ہے۔

پرنا ندی کے اس طرف کے بڑے بوڑھوں میں آج کل چرچے ہو رہے تھے۔ کچھ دنوں سے جنگل میں ایک عجیب طرح کی دہشت چھائی جا رہی تھی...

جگہ جگہ جانوروں کی ٹولیاں جمع ہو کر آپس میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ کہیں لومڑی اور گیدڑ آپس میں پھسپھسا رہے تھے۔ کہیں چار چھ شتر مرغ ایک دوسرے میں گردنیں ڈالے کھسر پھسر کر رہے تھے۔ چیتے کو اس طرف آتے دیکھ کر چپ ہو جاتے۔ لیکن سب کسی نہ کسی بہانے جنگل کے کنارے جا کر اس طرف دیکھ ضرور آتے تھے جس طرف انسانوں کی بستی تھی اور جہاں کی آبادی اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہر وقت کوئی نہ کوئی ضرور ندی کے کنارے کام کرتا نظر آ جاتا تھا۔ لیکن پچھلے کچھ دنوں سے لوگ سارا دن ندی میں کام کرتے نظر آ رہے تھے اور ادھر جانوروں کے دلوں میں خوف بیٹھتا جا رہا تھا کہ یہ بستی والے کوئی پل بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ پرنا ندی کے اس طرف بھی گھنا جنگل تھا اور سب جانور ڈکارتے چنگھاڑتے عیش کی زندگی گزارتے تھے۔ پتہ نہیں کب اور کیسے انسانوں کی بستی اس پہاڑی کے دامن میں آ کر

Scanned by CamScanner

بس گئی۔ پہلے پہل تو جانوروں نے ان کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ یہی سوچا تھا کہ اس زمین پر جتنا حق ان کا ہے اتنا ہی انسانوں کا بھی ہو گیا ہے۔ حالانکہ شروعات سے تو زمین جانوروں کی ہی ملکیت تھی لیکن جانوروں کی کچھ نسلیں بڑھتے بڑھتے جب انسانوں کی تہذیب میں شامل ہو گئیں تو وہ یہ سوچ کر چپ ہو گئے کہ ہر ایک کو اپنی طرح جینے کا حق ہے اور وہ تو آج بھی وہی حق مانگتے ہیں۔ جب انسانوں کی نسلیں زیادہ تیزی سے بڑھنے لگیں اور زیادہ چالاک ہونے لگیں تو ان میں غرور آنے لگا۔ ہاتھ میں ہتھیار آتے ہی خود کو دوسروں سے برتر سمجھنے لگے اور اس طرح جانوروں پر ظلم کرنے لگے۔ شروع شروع میں تو سب نے سہا۔ لیکن جینے کا حق تو سب ہی کو تھا۔ جانوروں نے بھی جوابی شکار شروع کر دیئے اور اس طرح آہستہ آہستہ انسان جنگلوں سے نکل کر میدانوں اور پہاڑوں میں رہنے لگے۔ جنگل کی تہذیب چھوٹ گئی اور بستیوں مکانوں میں بسنے لگے۔ اناج اگا کر کھانے لگے۔ پھر تو جانوروں نے انسان کو اپنی ذات سے ہی خارج کر دیا۔

گاؤں، بستیوں اور شہروں میں رہنے کے بعد بھی انسان کی کچھ حیوانی عادتیں ختم نہیں ہوئیں۔ وہ خود اپنی ذات میں بھی کمزور کو غلام بنانے لگا اور ہوتے ہوتے بہت سے ملکوں، مذہبوں اور ذاتوں میں بٹ گیا۔ جانور تو اب بھی ایک جنگل میں رہ لیتے ہیں۔ لیکن انسان ایک ملک میں بھی رہ نہیں پاتا اور اکثر اس کے بٹوارے کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کنبے میں بھی لڑائی جھگڑا کر کے گھر کا بٹوارہ کر لیتا ہے۔ موقع لگے تو ایک دوسرے کا حق بھی چھین لیتا ہے اور کوئی کمزور مل جائے تو اور ہی چڑھ بیٹھتا ہے۔ بس ایسے ہی کچھ خوف، کچھ دنوں سے اس جنگل کی ہوا میں بسے ہوئے تھے۔ سب جانور اسے سونگھ رہے تھے۔ لیکن کسی فیصلے پر نہیں پہنچ پا رہے تھے۔

ایک دن ایک بڑے بزرگ کی زبان کھل ہی گئی۔ بھڑک کر بولے۔

''دس بار گھر سے بے گھر کر چکے ہیں یہ لوگ ہمیں۔ آس پاس میں یہی ایک جنگل تو رہ گیا ہے۔ پل بنا کر اگر انسانوں نے اس طرف بھی بستی بنالی تو ہم سب کہاں جائیں گے؟ کبھی یہ ساری زمین ہماری تھی اور اب چپے چپے کے لیے ہمیں انسانوں کے رحم و کرم پر جینا پڑ رہا ہے۔ ان کی نسلیں تو ختم ہی نہیں ہوتیں۔ زمین چھوڑ کر اب چاند اور منگل (Mars) میں بھی جگہ ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور پھر... اف انسان کے لالچ نے تو ہمیں تباہ کر دیا۔''

کھانستے ہوئے ایک اور بوڑھے نے کان ہلائے:

''آنکھ کی شرم تو نہیں رہی انسان میں۔ ذرا سوچو کچھ ہی سالوں کی بات ہے جب سامنے کی پہاڑی کے نیچے آ کر بسے تھے یہ لوگ۔ پھر دیکھتے دیکھتے ہمارے پیڑ پودے کاٹنے شروع

Scanned by CamScanner

کر دیئے ان لوگوں نے۔ ببر خان شیر نے تب ہی کہا تھا کہ حملہ کرو۔ دو چار کو مار ڈالو۔ اپنے آپ بھاگ جائیں گے۔ ورنہ یہ جگہ ہمیں ایک دن خالی کرنا پڑے گی اور آخر وہی ہوا!"

ایک اور نے کہا:

"مجھے یاد ہے کس طرح ندی چڑھی ہوئی تھی۔ جب ہم اپنے بوڑھے ماں باپ کے کندھوں پر چڑھ کے رات کی رات اس طرف آ گئے تھے۔"

"اور وہ چھوٹے چھوٹے بچے جو ندی پار کرتے پانی میں بہہ گئے۔ اللہ ہی جانتا ہے ان کا کیا حشر ہوا۔"

"میں آج بھی ان کی چیخیں سنتی ہوں" کہتے کہتے بوڑھی ہرنی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

جنگل میں خوف کے ساتھ ساتھ ایک فکر اور اداسی بھی بڑھنے لگی تھی... اچانک سارے جنگل میں بے چینی کی ایک لہری دوڑ گئی۔ ہوا یوں کہ صبح زیبرا (Zebra) خاندان کا ایک لڑکا ندی کے کنارے پانی پینے گیا کہ ادھر کی بستی کے کچھ لوگوں نے شور مچانا شروع کر دیا۔ Zebra نے سر اٹھا کر دیکھا۔ اس نے سوچا شاید بستی کا کوئی بچہ پانی میں گر پڑا ہے۔ نظر آئے تو کود کے بچا لے۔ لیکن کچھ پتھر آ کر اس پر گرے اور اگلے ہی لمحے ایک تیر اس کی رانوں میں آ گھسا۔ وہ پلٹ کے جنگل کی طرف بھاگا۔ دور سے کچھ لوگوں کے چلنے کی آواز آئی۔ لہریا زیبرا بھاگ رہا تھا کہ ایک معصوم خرگوش جو واپس اپنے گھر کی طرف جا رہا تھا، ایک گولی کا شکار ہو گیا۔

شیر ببر خان جو کئی دنوں سے اپنے غار میں بیٹھا تمام حالات کا جائزہ لے رہا تھا اتر کر نیچے آیا۔ بہت سے جانور اس ٹیلے کے نیچے پہلے ہی سے جمع تھے۔ گڑگڑا کر سب نے اپنے غم کا اظہار کیا۔ شیر نے کھنکار کے ان کی فکر کا اعتراف کیا اور ایک اونچے سے پتھر پر پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ کچھ پرندے بھی پیڑوں سے اڑ اڑ کر پاس کی شاخوں پر آ بیٹھے۔ ان کی قسمت کا فیصلہ بھی ان چوپایوں کے فیصلے سے جڑا ہوا تھا۔ بہت دیر تک جلسے میں خاموشی رہی۔ خرگوش کی ماں ایک جھاڑی میں دبکی سسکتی رہی۔ لہریا کا تو سارا خاندان ایک جگہ آ کر جمع ہو گیا تھا۔

چیتا ایک طرف سے ٹہلتا ہوا آ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں۔ اس کے خاندان کے سارے لوگ کبھی انہی بستی والوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ اس نسل سے بس وہی بچا تھا۔

ہاتھی پرشاد نے سونڈ اس کی پیٹھ پر پھیری اور آنکھوں سے دھیرج رکھنے کا اشارہ کیا۔ چیتے کو برا لگا اور مڑ کے وہاں سے چلا گیا۔ جیسے جیسے جنگل میں خبر پھیلتی جا رہی تھی جانور اس ٹیلے کے نیچے آ کر جمع ہوتے جا رہے تھے۔ ہرن، بارہ سنگھا، سور بھی۔ آلسی الو بھی پہنچا۔ مگر آتے ہی آنکھیں موند کر پھر

Scanned by CamScanner

سو گیا۔ اچانک چیتا خون میں لت پت ایک انسان کی لاش لے کر وہاں پہنچا۔ سب نے اسے نفرت سے دیکھا۔ شاید اس نے بدلہ لیا تھا لیکن چیتے نے بتایا...

''اس انسان کو کسی انسان نے مار کر ندی میں پھینک دیا تھا۔ میں تو یہی دکھانے لایا ہوں کہ جو خود اپنی ذات پر رحم نہیں کرتا وہ ہم پر کیا رحم کرے گا۔''

شیر کی مونچھیں تن کے سیدھی کھڑی ہو گئیں۔ وہ چاروں پیروں پر جم کے کھڑا ہو گیا اور آہستہ آہستہ اونچی ہوتی ہوئی آواز میں کہنا شروع کیا...

''تھوڑا تھوڑا کر کے ہم اس زمین کے سارے جنگل انسانوں کو سونپ چکے ہیں۔ ہم نے ہمیشہ ان کی بڑھتی ہوئی نسلوں اور بڑھتے ہوئے مطالبات کے ساتھ سمجھوتہ کیا ہے۔ لیکن انسان اپنے نسلی فروغ کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس نے طرح طرح کے ہتھیار بنا لیے ہیں جن سے وہ اپنی نسل کے لوگوں کو بھی مارتا ہے۔ انسان وحشی ہو چکا ہے۔ جب وہ اپنی ذات والوں پر رحم نہیں کر سکتا تو ہمیں اس سے کسی قسم کے رحم کی امید کیسے ہو سکتی ہے؟ ہو سکتا ہے وہ ہمیں زمین سے بالکل مٹا دے۔ ہمارا نام و نشان ختم کر دے۔ ہم اس زمین کے سب سے پہلے باشندے ہیں۔ ہماری کتنی ہی نسلیں وہ ختم کر چکا ہے۔ لیکن اس بار ہمیں اپنی نسلوں کے لیے لڑنا پڑے گا۔''

سب جانوروں نے چنگھاڑ کر شیر ببر کے اس فیصلے کی حامی بھری۔ شیر نے دم کھڑی کر کے انہیں خاموش رہنے کی تلقین کی اور اپنی بات کو جاری رکھا...

''لیکن یاد رہے کہ اگر ہمارے جنگل کے کسی جانور پر حملہ ہوا تو ہم سب کو مل کر اس کا بدلہ لینا ہوگا۔ چاہے وہ چیونٹی ہو یا چیتا۔''

گردنیں جھکا کر مٹی میں تھوتھنیاں گھس کر سب نے وعدہ کیا۔ ایسا کرتے ہوئے شتر مرغ کی چونچ ٹوٹ گئی اور وہ کراہنے لگا۔ کچھ جانوروں کی ہنسی چھوٹ گئی۔ لیکن ببر کے کھڑے ہوتے ہی سب نے دم سادھ لیا۔ شیر نے کچھ لیڈر چنے۔ ایک ہاتھی، ایک بھالو (ریچھ)، ایک لومڑی اور ایک گھوڑا! اور کہا...

''اپنے جنگل کی حفاظت کے لیے اس کمیٹی کی رائے کے بغیر کوئی کچھ نہیں کرے گا۔''

اور چیتے کی ڈیوٹی لگا دی گئی کہ بستی والوں کے پل پر نظر رکھے اور اس کام میں سارے بندر اس کی مدد کریں۔ چیلوں سے کہہ دیا گیا کہ... ''اس بستی میں اگر کسی مشکوک حرکت کا پتہ چلے تو فوراً خبر کریں۔'' اگلے کچھ روز کچھ نہ ہوا۔ لیکن بستی والے اپنا پل آگے بڑھاتے رہے اور آہستہ آہستہ خطرہ جنگل کے پاس آتا رہا۔

Scanned by CamScanner

ایک روز ایک سفید چیل ٹیلے پر بیٹھی اور اس نے ایک لمبی سیٹی بجائی۔ شیر باہر نکل آیا۔ چیل نے خبر دی:

''اس طرف بستی میں بڑے بڑے کچھ پنجرے لائے گئے ہیں اور کچھ بند صندوقوں میں بندوقیں بھی آئی ہیں!''

''بندوقوں کی خبر کس نے دی۔ کاکروچ نے تلملاتے چوہے کو خبر کی اور وہ چوہا خبر لے کر بھاگ رہا تھا کہ ایک کوے نے...''

''کوا بہت ذلیل پنچھی ہے!'' شیر بیچ میں ہی بات کاٹ کر بولا۔ ''وہ انسان کی جوٹھن اور گندگی میں منہ مارتا ہے!''

''لیکن وہ بڑا سیانا ہے راجا! وہ انسان کو بھی چکمہ دے سکتا ہے۔''

''چکمہ دینے والے کو چالاک کہتے ہیں۔ سیانا نہیں۔ خیر تم اپنی بات پوری کرو۔''

''ہاں تو چوہے نے اس کاگارام کو بتایا کہ وہ ایک ضروری خبر دینے جنگل جا رہا ہے اور یہ خبر سب پرندوں اور جانوروں کے بارے میں ہے۔ ان کی جنگ آزادی کے بارے میں ہے۔ خبر سنتے ہی اس کاگارام نے اسے جنگل پار لاکر چھوڑ دیا اور تب سے وہ اسی جنگل میں ہے۔ کاگارام نے یہ خبر مجھے دی ہے۔''

شیر کسی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے کمیٹی کی میٹنگ بلانے کے لیے باہر کھڑی لومڑی کو حکم دیا۔

رات بھر کمیٹی کی خفیہ میٹنگ چلتی رہی۔ اگلے دن سب کو اپنے اپنے کام سونپ دیے گئے اور اس طرح جنگل کی جنگِ آزادی شروع ہوئی۔ چوہوں سے کہا گیا کہ ہر ایک گھر میں گھس کر بندوقوں کا پتہ لگائیں۔ جس جس گھر میں بندوق ہے، اس گھر پر نشان لگا دیں۔

''نشان کیسے لگایا جائے گا مالک؟''

''مالک مالک کہہ کے بات مت کرو۔'' ہاتھی نے چوہے کو ڈانٹ دیا۔ ''یہ عادت تم نے انسانوں سے سیکھی ہے۔ ہم طاقت میں بڑے ہیں۔ لیکن تمہارے مالک نہیں ہیں۔ تم قد میں ہم سے تھوڑے چھوٹے ہو لیکن ہم سے زیادہ کرتب جانتے ہو اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ...''

''مطلب کی بات کرو نا ہاتھی پرشاد! زیادہ بات کرنے کی تمہاری عادت جاتی نہیں۔'' بھالو نے ٹوک دیا۔ لومڑی نے مذاق کیا... ''بات کا بتنگڑ بناتے بناتے ہی تو یہ قد بنا ہے ان کا۔''

گھوڑے نے کھر سے پیر ٹھونک کر سب کو چپ کرا دیا۔ ''خاموش ہو جاؤ اور کام کی بات کرو۔''

Scanned by CamScanner

ہاتھی پرشاد نے پوچھا... ''تمہارا سوال کیا تھا چوہے لال؟''

''مکانوں پر نشان کیسے لگائے جائیں گے؟''

''بندروں سے کہو جنگل سے کیلے کے پتے لے کر جائیں اور ایک ایک کیلے کا پتہ دیوار سے چپکا دیں۔''

لومڑی نے تاکید کی... ''خاص طور پر کارتوسوں کی خبر لینی پڑے گی تاکہ سب سے پہلے ہم وہ تباہ کر سکیں۔''

بھالو نے ایک رائے دی... ''کیوں نہ چوہوں سے کہا جائے کہ جہاں جہاں کارتوس دیکھیں انہیں کتر کے ختم کر دیں۔''

سب نے حامی بھری اور اس طرح چوہوں نے اپنا پہلا حملہ شروع کیا۔

دو دن تک جنگل میں کوئی خبر نہیں آئی۔ سب حیران تھے کہ آخر ہوا کیا؟

تیسرے دن بندروں نے آ کر خبر کی کہ بیشمار چوہوں کی لاشیں باہر گلی میں پھینکی جا رہی ہیں۔

''لگتا ہے کارتوسوں میں کوئی زہریلی دوا ملا دی گئی ہے۔ جس سے چوہوں کی موت ہو گئی ہے۔''— چوہوں کی بستی میں ماتم چھا گیا۔

رات کے وقت شیران کی بستی میں گیا اور چھوٹے چھوٹے چوہوں کو دلاسہ دیا: ''ایک دن ایک چوہے نے جال کتر کے میری جان بچائی تھی۔ میں آج بھی چوہوں کا احسان مند ہوں۔ غم نہ کرو حوصلے سے کام لو۔ اس وقت ہم ایک بہت بڑی جنگ لڑ رہے ہیں۔ جس میں تمہارے ماں باپ شہید ہوئے ہیں۔''

چیتے کی آنکھیں آنسوؤں سے بھرنے کے بجائے پھر غصے سے لال ہو اٹھیں اور وہ ٹہلتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ بندوقوں اور کارتوسوں کی خبر ابھی تک نہیں ملی تھی۔ چوہے تو بہت سے گھروں سے پھینکے گئے تھے۔ کیسے اندازہ لگایا جائے کہ کارتوس کس گھر میں رکھے ہیں۔

ریچھ کو ایک بڑی پرانی ترکیب سوجھی... ''ایک خوبصورت سی ہرنی کو بستی کی گلیوں میں چھوڑ دیا جائے۔ کوئی نہ کوئی تو بندوق لے کر نکلے گا۔ بس اسی گھر میں سمجھو۔''

''ہونہہ! اور ہرنی بیچاری کو مروا دیا جائے۔'' ہاتھی نے اعتراض کیا۔

''بات تو پوری سنتے نہیں— سنو!... چھتوں منڈیروں پر کوے بٹھا دیئے جائیں۔ جیسے ہی کوئی بندوق نکالے گا وہ سب ''بھاگ بھاگ'' چلا کر خبر کر دیں گے۔ ہرنی بھاگ جائے گی اور گھر کا پتہ چل جائے گا۔''

Scanned by CamScanner

''اور کوے ہمارا یہ کام کیوں کرنے لگے۔''

''کیوں نہیں؟ آخر ان کی قدیم تہذیب بھی تو جنگل کی تہذیب ہے!''

''لیکن انہیں منایا کیسے جائے؟''

''کاگا رام ایک کوا کئی دنوں سے ہمارے جنگل میں ہے۔ مجھے الو میاں نے بتایا تھا۔''

''کہیں سپنے میں دیکھا ہوگا۔ ہر وقت تو سوتے رہتے ہیں۔''

''ایسا مت کہئے بہت پہنچے ہوئے پیر ہیں۔ دونوں جہان کی خبر رکھتے ہیں۔''

''لیکن ایک بات ہے شیر سے ہرگز مت کہنا... اسے کوؤں سے سخت نفرت ہے۔''

''ہم خود ہی یہ کام کر لیتے ہیں۔ راجہ خوش ہو جائے گا جس دن کارتوس کی خبر لے کر جائیں گے۔'' — سب کے سب ہرنوں کی ٹولی کے پاس پہنچے۔ سب کے سب ڈر گئے۔ لیکن سنینی سامنے آ گئی۔

''نہیں نہیں سنینی تم مت جاؤ۔ تمہارا ڈیڑھ سال کا لڑکا ہے۔''

''تو کیا ہوا؟ لڑکی تھوڑے ہی ہے! سنینی بولی۔

سنینی تیار ہو گئی۔

کاگا رام نے بستی میں جا کر بات کی۔ سب کے سب شور مچانے کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن خطرہ کوئی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔

''اس میں خطرہ کس بات کا ہے؟ سب منڈیروں پر، چھتوں پر، بجلی کے تاروں پر بیٹھے رہیں گے۔ جیسے ہی کسی نے بندوق نکالی، چلا پڑیں گے... بھاگ... بھاگ...!''

''کس وقت؟''

''صبح...!''

سنینی اگلے دن چھلانگیں بھرتی بستی کی گلیوں میں گھومنے لگی۔ کوے گھروں پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ کہیں کوئی بندوق لے کر نکلے اور وہ ''بھاگ بھاگ'' چلانا شروع کر دیں۔

بہت سے لوگوں نے کھانا ڈال کر ہرنی کو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ایسے کہاں ہاتھ آنے والی تھی۔ کچھ لوگ چودھری کے پاس پہنچے۔

''مالک، ایک بڑی خوبصورت ہرنی گلیوں میں کھلم کھلا گھوم رہی ہے۔ آپ چل کے شکار کر لیجئے۔''

چودھری جیسے ہی ہاتھ میں چھڑی لے کر حویلی سے نکلا، کوؤں نے ''بھاگ بھاگ'' چلانا شروع

Scanned by CamScanner

کردیا۔ سب کوے ہرن کی طرف اڑے۔ ہرنی اس جگہ سے کافی دور تھی۔ وہ بے تحاشہ ندی کی طرف دوڑی۔ لیکن اسی وقت کچھ لوگوں نے جال پھینکا اور زندہ پکڑ لیا اسے۔

تھوڑی ہی دیر میں گھوڑے پر سوار چودھری وہاں پہنچ گیا۔ پکڑنے والوں کو پیسے دے کر انہوں نے ہرنی ان سے خرید لی اور رسی سے باندھ کر گھوڑے کے پیچھے پیچھے بھگاتے ہوئے حویلی کی طرف لے گئے۔ کاگا رام نے جنگل میں آکر پوری خبر سنائی۔

شیر غصے میں آگیا... ''سنینی کو کس نے بستی میں بھیجا تھا؟''

کمیٹی والوں کے چہرے لٹک گئے۔ سب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ شیر پھر سے دہاڑا...

''اور وہ بھی کمبخت ان کوؤں کی نگرانی میں جنہیں ہاتھ کی چھڑی اور بندوق میں فرق پتہ نہیں چلا۔''

غصے میں شیر بہت دیر تک ادھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ بہت دیر کے بعد اس نے ایک رائے دی...

''میرا خیال ہے بندوقیں اور کارتوس اس چودھری کے گھر میں ہوں گی۔ وہی بستی کا سب سے بڑا آدمی لگتا ہے۔''

سب نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''ہمارا بھی یہی خیال ہے۔''

اوپر شاخ پر بیٹھے الو نے ایک لمبی جمائی لے کر آنکھیں کھولیں اور بولا...

''وہ سب سے امیر آدمی ہے، سب سے بڑا نہیں...!''

''تو سب سے بڑا کون ہے؟''

''وہاں کا تھانیدار۔ مرضی چودھری کی چلتی ہے اور حکم تھانیدار کا۔''

''ہم نے سنا ہے بستی میں کچھ بڑے بڑے پنجرے اور بندوقوں کی پیٹیاں آئی ہیں۔ کچھ بتا سکتے ہو، وہ کہاں ہوں گی؟''

''تھانے میں! تھانیدار اور کہاں رکھے گا؟''

سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ شیر نے اونچی آواز میں کہا...

''وہی جگہ سب سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ وہاں رات کے وقت بھی پہرہ رہتا ہے۔''

لومڑی کو کبھی کبھی دور کی سوجھتی ہے۔ بولی... ''پہرہ تو سامنے رہتا ہے اور سامان پیچھے کے گودام میں ہوگا۔ اگر اس کا دروازہ کھولا جا سکے!''

الو میاں بولے... ''آپ بھی عجیب بات کرتی ہیں لومڑی بی۔ دروازہ کیا چابی سے کھولیں گی

Scanned by CamScanner

آپ؟ یوں کیجئے اگر دروازہ توڑا جا سکے۔"

ہاتھی فوراً تیار ہو گیا... "میں توڑ دوں گا وہ دروازہ۔ اگر انسانوں کے لیے ہم قلعوں کے دروازے توڑ سکتے ہیں تو اپنے لیے کیا ایک گودام کا دروازہ نہیں گرا سکتے؟"

شیر ببر نے منع کر دیا۔ "تم گیڑے مکوڑے نہیں ہو کہ چھپ کر نکل جاؤ گے۔ پکڑ لیے گئے تو؟"

"لیکن میں رات کے وقت جاؤں گا!"

"ضرورت نہیں!" شیر نے حکم دیا۔

لومڑی نے دوبارہ پوچھا... "تو گودام کا دروازہ کیسے کھولیں گے؟"

شیر نے ایک لمبی سانس لی اور کہا... "گودام کا دروازہ چیونٹی رانی کھلوائے گی!"

"وہ کیسے؟"

سب نے حیرت سے شیر کی طرف دیکھا۔

چیونٹی رانی کو بلوایا گیا۔

پانچ کنیزوں کے ساتھ چیونٹی رانی شیر کے سامنے حاضر ہوئی۔ شیر نے ساری اسکیم سمجھائی۔

"رانی اپنے سب سے تیز دستے کو لیکر جاؤ اور چوہدری کے ہاتھی، مہابلی کو اپنے قابو میں لے لو۔ وہ چلائے گا چنگھاڑے گا۔ لیکن تم اسکے کان میں جا کر رک جانا اور کہہ دینا کہ وہ تمہارے ساتھ چلے اور گودام کا دروازہ توڑ دے ورنہ کان میں گھس کر تم اسے مار دو گی۔ وہ یقیناً مان جائے گا۔"

حیرت سے سب جانوروں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔

"واہ شیر ببر نے کیا چال چلی ہے۔ مارا بھی جائے تو ہمارا خدار جانور!"

"ہم کسی جانور کا خون کرنا نہیں چاہتے!" شیر نے باقی پروگرام بھی تفصیل سے سمجھایا۔ "ہاتھی جب دروازے پر پہنچ جائے تو پانچ سو چیونٹیاں تھانے کے باہر سپاہیوں پر جھپٹیں گی تا کہ وہ لوگ گھبرا کے اندر چلے جائیں اور دروازے کھڑکیاں بند کر لیں۔ اس طرح دروازہ ٹوٹنے کی آواز ان تک نہیں پہنچے گی۔ دروازہ ٹوٹنے کے بعد ڈیڑھ ہزار جگنو گودام میں گھس کر روشنی کریں گے۔ بندوق اور کارتوس کی پیٹیاں توڑنے کے بعد انہیں ہاتھی کے پاؤں تلے کچل دیا جائے گا۔ رات کے رات یہ کام کر کے سب کے سب صبح ہونے سے پہلے واپس آ جائیں گے!"

سب نے مل کر شیر کی جے جے کار کی۔

سب کچھ پلان کے مطابق ہوا۔ چیونٹیوں کے دستے نے ہاتھی مہابلی کو اپنے بس میں کیا اور بنا شور مچائے اسے حویلی سے نکال کر لے گئے۔ چیونٹیاں ٹھیک وقت پر تھانے میں داخل ہوئیں اور

Scanned by CamScanner

تمام سپاہیوں کو بوکھلا دیا۔ جگنوؤں کی روشنی سے گودام میں دن کی طرح اجالا ہوگیا۔ ان کے لیڈر جگنو سنگھ کو بہت سے جگنو بجھانے پڑے۔ بندوقوں اور کارتوسوں کو کچل کچل کر دلیہ (ملیدہ) بنا دیا گیا۔ لیکن یہ سب کرتے کرتے صبح ہوگئی اور تھکا ہارا مہابلی جب گودام سے نکل رہا تھا تو صبح کی ڈیوٹی پر آتے ہوئے تھانیدار نے اسے دیکھ لیا۔

جنگل کے حملہ آور واپس اڑ چکے تھے۔ چیونٹی رانی اپنا دستہ لے کر واپس جا رہی تھی۔

تھانیدار سیدھا گودام میں آیا اور وہاں کی حالت دیکھ کر ہاتھی کے پیچھے بھاگا۔ ہاتھی کے ماتھے سے پسینہ ٹپک رہا تھا۔ تھکاوٹ کے مارے لڑکھڑا رہا تھا۔ تھانیدار نے سمجھا ہاتھی پاگل ہوگیا ہے۔ وہ ضرور بستی میں جا کے توڑ پھوڑ کرے گا۔ اس نے فوراً پستول نکالی اور ہاتھی کے سر میں پانچ کی پانچ گولیاں داغ دیں۔ ایک لمبی چنگھاڑ مار کر ہاتھی زمین پر گرا اور دیکھتے دیکھتے اس نے تڑپ کر جان دے دی۔ یہ ساری خبر جب جنگل میں پہنچی تو جنگل کے ہاتھی پر شاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مہابلی اس کی بڑی بوا کا لڑکا تھا۔

اگلے دن جنگل میں پھر سناٹا رہا۔ لیکن اس میں خوف کم اور ہمت زیادہ تھی۔ جانور اپنی پہلی چال میں کامیاب ہوگئے تھے۔ لیکن بستی کی طرف سے اب کیسے حملہ ہوگا کوئی نہیں جانتا تھا۔ پل پر باقاعدہ کام چل رہا تھا اور لگتا تھا کہ دو چار دنوں میں وہ پورا ہو جائے گا۔ کمپنی والے سارا دن ٹیلے پر کسی خبر کے آنے کا انتظار کرتے رہے۔ سفید چیل کئی بار جنگل تک آ کے واپس چلی گئی۔ کاگا رام کی دور تک کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ آہستہ آہستہ شام ڈھلی اور رات ہوگئی۔

اگلا دن اور اگلی رات ویسے ہی گزری۔ پل تقریباً جنگل والے کنارے تک آ پہنچا۔

چیتا رات بھر جاگ کر پہرا دیتا۔ ایک رات اسے اپنے پاس ہی کسی کے رونے کی آواز آئی۔ پاس کی جھاڑیوں میں جا کر دیکھا تو ایک کمسن ہرن دبکا بیٹھا تھا۔

"کون ہو بیٹا اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں سنینی کا بیٹا ہوں۔ میری ماں اس طرف پکڑی گئی ہے۔ میں اس کے پاس جانا چاہتا ہوں۔ الو میاں نے بتایا کہ وہ چودھری کے گھر میں ہے۔ چودھری سے کہوں گا کہ مجھے رکھ لے میری ماں کو چھوڑ دے۔ مجھے وہاں لے چلو۔"

چیتے کو سنینی کے بیٹے پر ترس آ گیا۔

"دیکھ بیٹا— چودھری تجھے بھی رکھ لے گا اور تیری ماں کو بھی نہیں چھوڑے گا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں ماں کے پاس رہ کر اس کا خیال تو رکھ سکتا ہوں۔"

Scanned by CamScanner

''ایسا نہیں ہوگا بیٹا۔ وہ چڑیا گھر کے لیے بیچ دے گا تمہیں اور کہیں دونوں کو الگ الگ بیچ دیا تو کیا کرو گے؟'' سنینی کا بیٹا سچال چپ ہوگیا۔ لیکن اس کے آنسو بہتے رہے۔ کچھ دیر اور خاموش رہنے کے بعد چیتے نے پوچھا...

''تم نے شیر سے کیوں نہیں کہا؟ آخر تمہاری ماں جنگل والوں ہی کے لیے ہی تو اس طرف گئی تھی۔''

سچال نے سر جھکا کے دھیمے سے کہا:

''رلجہ کے پاس جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔''

''چل!... میرے ساتھ چل!''

چیتا سنینی کے بیٹے کو لے کر شیر کے پاس گیا۔

لومڑی باہر پہرے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ رلجہ دیمک کے ساتھ ایک لمبی میٹنگ کرنے کے بعد ابھی ابھی آرام کرنے گیا ہے۔

''دیمک؟'' چیتے نے حیرت سے پوچھا... ''وہ کون ہے؟''

''جنگل میں رہتے ہو اور دیمک کو نہیں جانتے؟ دیمک چاہے تو رات کی رات میں سارا جنگل کھا جائے۔ وہ تو لوہا لکڑی پتھر سب کھا جاتی ہے!''

'شیر کو دیمک سے کیا کام پڑ گیا؟''

ان لوگوں کی آواز سن کر شیر غار سے باہر آ گیا۔ پوچھا...

''کیا ہے؟ پل کی نگرانی چھوڑ کر تم کیوں آ گئے؟''

مزاج سے تو غصیلہ تھا ہی چیتا، چڑ کر بولا...

''کیا فائدہ اس پل پر پہرہ دے کر؟ وہ تو کل پورا ہو جائے گا۔''

''پورا، نہیں کل ختم ہو جائے گا۔ میں نے آج ہی دیمک کو حکم دیا ہے۔ کل تک اس پل کے کھوکھلے ٹکڑے ندی میں بہتے نظر آنے چاہئیں۔ آج کی رات بہت اہم رات ہے۔ جاؤ اور اپنی جگہ پر پہرہ دو۔ کوئی آج رات ادھر آنے کی کوشش کرے تو ہمیں خبر کرنا۔ تمہیں معلوم نہیں ہاتھیوں کے دل، بھیڑیوں کی ٹولیاں، چمگادڑوں کے جھنڈ، بھالو اور لومڑیوں کے گروہ کس طرح رات رات بھر جاگتے ہیں۔ ایک آواز پر مرمٹنے کے لیے تیار بیٹھے رہتے ہیں۔'' یہ کہہ کے شیر واپس غار میں چلا گیا۔

چیتا کچھ حیران کچھ پریشان پل پر واپس لوٹ آیا۔ سچال اس کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ وہ ابھی تک چپ چاپ سسک رہا تھا۔ چیتا اٹھا اس کا ہاتھ پکڑ کے بولا...

Scanned by CamScanner

''چل پل کے اس پار چلتے ہیں۔ پل ٹوٹنے سے پہلے ہم سنینی کو واپس لے کر آ جائیں گے۔ چل!''

آن کی آن میں اس نے فیصلہ کیا اور سچال کو ساتھ لے کر ادھر بستی میں پہنچ گیا۔

دبے پاؤں سنسان گلیوں سے گزرتے ہوئے دونوں چودھری کی حویلی تک پہنچے۔ اتنی بڑی حویلی میں کیسے پتہ چلتا کہ ہرنی کس جگہ بندھی ہے۔ دیوار کے اوپر سے ایک بلی گزر رہی تھی۔ چیتے کی نظر اس پر پڑ گئی۔ کان کھینچ کے چیتے نے تنبیہ دی...

''آواز کی تو تیری ساری نسل ختم کر دوں گا۔ جلدی بتا چودھری نے سنینی کو کہاں باندھا ہے؟''

''اصطبل کے پیچھے ایک کوٹھری ہے، اسی میں بند کر رکھا ہے۔''

''اس کوٹھری کا راستہ کس طرف ہے؟''

''میرے ساتھ آؤ، میں لے چلتی ہوں۔''

کوٹھری پر پہنچے تو دیکھا دروازے پر ایک بھاری تالا پڑا ہے۔ کھڑکی اندر سے بند تھی۔ صرف ایک ہی راستہ تھا۔ اوپر کا روشن دان۔ چیتے نے بلی سے کہا...

''تو اوپر سے کود کے اندر جا اور کھڑکی کا دروازہ کھول دے باقی کام میں خود کر لوں گا۔''

بلی نے ایسا ہی کیا۔ کھڑکی کھلتے ہی چیتا اندر گیا اور رسی توڑ کے سنینی کو باہر لے آیا۔ سنینی سچال کو دیکھتے ہی پاگل ہو اٹھی اسے چومنے چاٹنے لگی۔ لیکن چیتے نے پھر خبردار کیا۔

''جلدی کرو اور بستی سے نکل چلو ورنہ پکڑے جائیں گے۔''

بلی نے اجازت چاہی...

''میں آؤں؟''

چیتے نے اجازت دیتے ہوئے کہا...

''خبردار! آج رات کی بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔''

بلی نے وعدہ کیا اور چلی گئی۔ لیکن اس نے غداری کی اچھلتی کودتی چودھری کے کمرے میں گئی اور گلدان گرا کے اسے جگا دیا۔ چودھری جاگا تو وہ بالکنی میں جا کر کھڑی ہو گئی تاکہ چودھری باہر آئے۔ چیتا، سنینی اور سچال نیچے گلی سے گزر رہے تھے۔ وہ ایسے دیوار سے لگتے ہوئے جا رہے تھے کہ بالکنی سے کسی کی نظر ان پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ لیکن اسی وقت بلی کی میاؤں سن کر چیتے نے اوپر دیکھا تو اس کی نظر چودھری پر پڑی۔ بالکنی میں کھڑا چودھری انگڑائی لے رہا تھا۔

پل کی پل میں چیتے کا خون کھولنے لگا۔ وہی تھا جس نے اس کے ماں باپ کا خون کیا تھا۔

Scanned by CamScanner

ان کی کھال اتروا کر ایک انگریز کو بیچ دی تھی۔ بدلے کا ارادہ اس کے دماغ میں بھنانے لگا۔ اس نے سنینی اور سچال سے کہا...

''جتنا تیز بھاگ سکتے ہو بھاگو اور پل پار کر کے جنگل میں پہنچ جاؤ۔ میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں...!''

''لیکن تم کہاں جا رہے ہو؟''

''زیادہ سوال مت پوچھو اور جو کہتا ہوں وہ کرو۔''

سنینی اور سچال کو بھگا کر چیتے نے پھر بالکنی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ دبے پاؤں وہ دیوار پر چڑھا۔ دیوار سے پیڑ پر کودا اور پیڑ سے سیدھا بالکنی میں۔ چودھری اپنے بستر پر جا چکا تھا۔ اچانک چودھری کی نظر چیتے کی چمکتی ہوئی آنکھوں پر پڑی۔ اس کی چیخ نکل گئی۔ چیتا کود پڑا، اس پر اور ایک ہی پل میں اس کا کام تمام کر دیا۔ سنینی اور سچال پل کی دوسری طرف پہنچ کر چیتے کا انتظار کرنے لگے۔ انتظار کرتے کرتے صبح ہو گئی۔ لیکن چیتا نہیں پہنچا۔ دونوں کی فکر بڑھ گئی۔ گھبرا کر دونوں نے فیصلہ کیا کہ شیر کو بتا دیں اور رات جو کچھ ہوا تھا اس کی پوری خبر کریں۔

شیر نے سنا تو سناٹے میں آ گیا۔

''یہ کیا ہو گیا؟ چیتے نے ایسی غلطی کیوں کی؟ مجھے ہمیشہ سے یہی ڈر تھا کہ اس کا غصیلہ مزاج کسی نہ کسی دن اسے لے ڈوبے گا۔''

بہت دیر تک شیر ادھر سے ادھر ٹہلتا رہا۔ اس نے سفید چیل کو دوڑایا۔

''جلدی سے چیتے کی خبر لے کر آؤ۔ وہ کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟'' خبر آگ کی طرح جنگل میں پھیل گئی۔ جنگل کے چرند پرند فکرمند ہو گئے۔ چیتا اپنی نسل کی آخری نشانی تھا۔ جنگل کی شان تھا وہ۔ ایک بار پھر سارے جنگل میں وہی سناٹا چھا گیا۔

سفید چیل نے آ کر خبر دی...

''چودھری مارا گیا ہے اور چیتا پکڑا گیا ہے۔ وہ بری طرح زخمی ہو چکا ہے۔ اسے بڑے پنجرے میں بند کر کے آج ہی شہر کے چڑیا گھر میں بھیجا جائے گا۔ اس کے لیے دو گھوڑوں کی ایک تیز رفتار گھوڑا گاڑی تیار کی جا رہی ہے۔''

لومڑی نے رائے دی کہ فوراً میٹنگ بلائی جائے اور کسی طرح چیتے کو چھڑانے کا بندوبست کیا جائے۔ شیر نے غصے میں ہنکار کے اس کی رائے کو رد کر دیا۔

''تو کیا کرو گے راجہ؟''

Scanned by CamScanner

میں خود جاؤں گا اسے چھڑانے، یہ بحث مباحثے کا وقت نہیں، عمل کا وقت ہے!

شیر فوراً پل کی طرف چل دیا۔

پل پر پہنچا تو پل ٹکڑوں میں گل کے ندی میں گرتا جا رہا تھا۔ دیمک اپنا کام پورا کر چکی تھی۔ لیکن شیر کے قدم ایک پل کے لیے بھی نہیں رکے۔ وہ فوراً پانی میں کود گیا اور جنگل والے دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ ندی پار کر کے شیر جب بستی میں داخل ہوا تو بستی میں بھگدڑ مچ گئی۔ لوگ بھاگ بھاگ کے گھروں میں گھسنے لگے۔ سفید چیل لمبی سیٹی جیسی آواز کرتی ہوئی اوپر اڑ رہی تھی اور شیر کو راستہ بتا رہی تھی۔ تھانے کے باہر والے میدان میں گھوڑا گاڑی تیار کھڑی تھی۔ پنجرا، اوپر رکھا جا چکا تھا۔ چیتے کو دیکھنے کے لیے ایک بھیڑ جمع تھی۔ شیر کی دہاڑ سنتے ہی ساری بھیڑ تتر بتر ہو گئی۔ گھوڑوں کے اوسان گم ہو گئے۔ وہ بے تحاشہ بھاگ لیے۔ شیر نے پیچھا کیا۔

گلی کوچوں میں توڑ پھوڑ کرتے گھوڑے، ندی کے ساتھ ساتھ جاتی ہوئی سڑک پر ہو لئے۔ ان کا رخ شیر کی طرف تھا۔ آخر ایک موڑ پر شیر نے انہیں گھیر لیا۔ ایک گھوڑا تو شیر کو چھلانگتے دیکھ کر ہی بے ہوش ہو گیا اور دوسرا تین ٹانگوں پر لڑھکتا اپنی جان بچا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ منہ سے چبا کے شیر نے پنجرے کی سلاخوں کو چیر کے رکھ دیا اور چیتے کو آزاد کرا لیا۔

چیتا نیم غشی کی حالت میں تھا۔ شیر نے اسے کندھوں پر لیا اور ندی میں کود پڑا۔ ندی کے دوسرے کنارے پر باقی جانور بھی پہنچ گئے۔

سب کے منہ سے ایک ہی بات نکلی...

''جنگل کا راجہ سچ مچ جنگل کا راجہ ہے!''

چیتے کی حالت ڈوبتی جا رہی تھی۔ الو میاں نے بہت علاج بتائے لیکن کوئی کام نہ آیا۔ بہت دوڑ دھوپ کے باوجود بھی تین روز کے بعد چیتے نے جان دے دی۔

اس کے اگلے ہی دن کی بات ہے۔ بستی کے کچھ لوگ کشتی لے کر جنگل والے کنارے پر آئے۔ ان میں ''سالم علی'' (سالم علی) نام کا ایک بوڑھا سا شخص بھی تھا جو پرندوں سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ لوگ اپنے ساتھ ایک لمبا سا بورڈ لے کر آئے تھے۔

کچھ گھنٹوں کے بعد وہ لوگ واپس چلے گئے۔ اس جنگل میں وہ بورڈ لگا گئے جس پر لکھا تھا...

''جنگل کی زندگی انسان کی زندگی کی طرح ہی قیمتی ہے۔ اسے بچانا ہمارا فرض ہے؟''

[نیشنل وائلڈ لائف سینچری]

Scanned by CamScanner

○

گلزار کا تخلیقی کولاژ

Scanned by CamScanner

گلزار کا تخلیقی کولاژ

①

کہانیاں بدن سوں ہوتی ہیں، الگ الگ طرح کے بدن— کسی میں کوملتا، نازکی، کسی میں جوش آکروش، کوئی چھریرا، کوئی بھاری بھرکم، کوئی باکیف، کوئی بے کیف اور اس بدن کی تشکیل لفظ اور احساس کے ملن سے ہوتی ہے۔ لفظ اور احساس کا جتنا پری پورن ملن ہوگا، کہانی اتنی ہی سندر ہوگی۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ کہانی کی سندرتا کے لیے جو ضروری عناصر ہیں، وہ پوری قوت کے ساتھ موجود ہوں تو اس کی سندرتا کو کوئی دیکھے، یا نہ دیکھے اس کا جادو برقرار رہے گا اور کبھی نہ کبھی، کوئی نہ کوئی درشٹی، کوئی سوندریہ پپاسو، اسے ضرور کھوج نکالے گا۔ یہ میری سوچ ہے، غلط یا صحیح— اس سے مجھے قطعی کوئی مطلب نہیں۔ میرے پاس اپنی باتوں کا منطقی جواز ہے، میرے لیے الفاظ بھی ویکتی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ میں لفظوں کے سوبھاؤ، مزاج اور رویوں پہ نظر رکھتا ہوں۔ لفظوں کی پرسنالٹی اور فیگر، خیال کی پرسنالٹی اور فیگر، اگر خوبصورت ہیں تو کہانی لازماً خوبصورت ہوگی۔

فکشن میرا میدان نہیں، ہاں کہانیاں پڑھنا میرا شوق ضرور ہے۔ اچھی کہانیاں— وہ کہانیاں جن میں طلسم نگری آباد ہو، جن میں عجائبات کے سفت در روشن ہوں، جو ایک نئی پچویشن سے دوچار کریں، جن میں کچھ نیا ہو، کچھ مختلف ہو۔ فکر کی دوشیزگی ہو اور الفاظ کی بکارت— اُردو کے گنی گیانی بدھیمان فکشن کے حوالے سے چاہے کچھ بھی فرماتے رہیں، ان کے فرمودات اپنی جگہ۔ مگر ہم کہانی کو نہ وارث علوی کی آنکھ سے پڑھتے ہیں، نہ فاروقی اور مہدی جعفر کی آنکھ سے۔ ہمارے لیے اپنی آنکھ ہی کافی ہے۔ کیونکہ ہماری آنکھیں سلامت ہیں۔ ہم کسی آشوب چشم کے مریض بھی نہیں۔ تو صاحبو! مجھے کہنے دیجئے کہ اس الف صدی میں کیا کسی نے کوئی نئی دیومالا جنم دی ہے جسے صدیوں تک یاد رکھا جائے۔ جو الف لیلہ اور پنچ تنتر کی طرح ذہن و دل میں پناہ گزیں ہو۔ تو جواب نفی میں ہوگا۔ آج کا افسانہ repretive circle میں گھوم پھر کر تباہ و برباد ہو رہا ہے۔ بوجھل فلسفہ، بے

Scanned by CamScanner

کیف زبان، لطف ولذت سے عاری بیان، آج کے فکشن کے حصے میں شاید یہی کچھ آیا ہے۔ کہانی کی یہ رجعت قہقری مجھے کبھی کبھی بہت اُداس کر دیتی ہے۔ لیکن خوشی کی بات یہ ہے آج بھی کچھ اچھے افسانہ نگار موجود ہیں جنہوں نے کچھ نئے تجربے کئے ہیں اور اردو افسانے کو نئی جہات سے روشناس کیا ہے۔ ان میں ایک نام گلزار صاحب کا بھی لیا جاسکتا ہے۔

(۲)

کیا سونے کی انگوٹھی
پیتل کے گھنٹوں کی طرح آواز کرے گی؟
مہان گنگا کی دھارا شانتی سے بہتی ہے
پر ایک چھوٹا نالہ ہو ہلا کرتا، کودتا پھاندتا بہتا ہے!

(ویمنا تیلگو شاعر)

ہمارے یہاں کے بیشتر تخلیق کار، ہوا کے گھوڑے پہ سوار ہیں۔ انہیں شہرت، عزت اور نام و نمود کی اتنی تمنا ہے کہ اس کے لیے غیر ادبی اور غیر اخلاقی حربے استعمال کرنا بھی اپنا ادبی منصب سمجھتے ہیں۔ جب کہ ان میں سے بیشتر erectile dysfunction کے شکار ہیں۔ ان کے اندر تخلیقی قوت کی بے انتہا کمی ہے۔ ایسے تخلیق کاروں کی ادبی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ چند لمحے، چند ساعتیں، چند ایام — کیونکہ وہ تخلیق کے نام پر صرف فریب کاری کرتے ہیں۔ جب کہ تخلیق وہ ہوتی ہے جس میں باطنی تحیرات کے در وا کئے جائیں اور ایک نامعلوم، انجانی کائنات کی سیر کی جائے۔ تخلیق مکاشفہ کا عمل ہے، اسی لیے ہر وہ تخلیق جس میں تحیر، استعجاب اور اسرار ہو، وہ بلند بالا اور ارفع ہوتی ہے۔

گلزار کی کچھ کہانیاں یقیناً ایسی ہیں جن میں اسرار بھی ہے اور باطنی تحیر بھی۔ گلزار کہانی کہنے کا آرٹ جانتے ہیں کہ عمر اسی دشت کی سیاحی میں گزری ہے۔ وہ زندگی کے متنوع تجربات سے گزرے ہیں۔ مشاہدات کے بہت سے مناظر، ان کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ فلم نگری نے انہیں نئے نئے تجربوں سے آشنا کیا ہے، عجائبات کی ایک زنبیل عطا کی ہے۔ گلزار کی کہانیوں میں سادگی ہوتی ہے، ابہام اور اہمال نہیں۔ enigma اور puzzle نہیں۔ وہ ترسیل کے زاویے سے کہانی

Scanned by CamScanner

لکھتے ہیں تا کہ کہانی کا impact ہر چھوٹے اور بڑے ذہن پر پڑے۔ ان کی کہانیوں میں کمیونیکیشن کی بھرپور قوت و کیفیت موجود ہے۔ ان کی کہانی کا کوئی مخصوص طبقہ یا حلقہ نہیں بلکہ ہر وہ شخص ان کی کہانی کا قاری ہے جو اس کائنات میں سانسیں لے رہا ہے۔ سورج کی روشنی اور چاند کے نور سے اکتساب کر رہا ہے۔ ہر طبقہ کا فرد، ان کہانیوں میں خود کو identify کر سکتا ہے۔

گلزار کی کہانیوں میں یکسانیت نہیں، تنوع ہے۔ انہوں نے نہ لسانی شکست و ریخت کا تجربہ کیا ہے اور نہ نئی لسانی تشکیل کا۔ انہوں نے انسانی سچویشن کی کہانیاں لکھتے ہوئے بہت ہی سادہ بیانیہ انداز اپنایا ہے اور علامت اور تجرید کے بھیانک جنگلوں میں بھٹکنے کی غلطی بھی نہیں کی ہے۔ ان کی کہانیوں میں سماجی معنویت مقصدیت ہے اور جدید عصری حسیت، تہذیبی فضا آفرینی بھی۔ انہیں تہذیبی روایت کا شعور بھی ہے اور تہذیبی لاشعور کا احساس بھی۔ ان کی ہر کہانی کا رنگ دوسری کہانی سے مختلف ہوتا ہے۔ 'راوی پار' میں جو افسانے شامل ہیں۔ وہ موضوعاتی تنوع اور اسلوبیاتی اختصاص کی وجہ سے انفرادی اہمیت کے حامل ہیں۔

بملدا: اس کہانی میں حقیقت اور فنتاسی کا خوبصورت امتزاج ہے۔ انسان کے تحت الشعور یا لاشعور میں جو پرچھائیاں، آرزوئیں اور تمنائیں ہوتی ہیں، وہ حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں۔ کہانی ایک فلم ڈائریکٹر 'بملدا' کی ہے جو کمبھ پر فلم بنانا چاہتے ہیں اور وہ فلم کی کہانی کے ساتھ کئی برس گزارتے ہیں اور فلم کی فنتاسی کو reality عطا کرنے کے لیے کمبھ کا انتظار کرتے ہیں۔ وہ کینسر کے مریض ہیں اور بے تحاشہ سگریٹ پھونکتے رہتے ہیں۔ ان کے ذہن پر کمبھ اس طرح حاوی ہے کہ رات دن بس اسی کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ ایک ناول 'امرت کی کھوج' کا ایک کردار ان کے ذہن پر مکمل طور پہ حاوی ہے۔ وہ اس کردار میں اپنا عکس تلاش کرنے لگتے ہیں اور وہی کردار جینے لگتے ہیں:

> ''وہ جو رائٹر ہے نا، جس کی نظر سے یہ کہانی کہی گئی ہے، جو امرت کی کھوج میں گیا ہے مجھے لگتا ہے وہ میں ہوں۔ وہ جس امرت کی تلاش میں گیا ہے، جس سے آدمی کی عمر سو سال کی ہو جاتی ہے۔ وہ...''

بالآخر یہ ہوتا ہے کہ فلم پوری ہونے سے پہلے ہی ان کی موت ہو جاتی ہے اور موت عین جوگ اشنان کے دن ہی ہوتی ہے۔ بملدا نے چونکہ اس فلم کا کردار جینا شروع کر دیا تھا اور اس کردار ہی میں اپنا عکس تلاش کرنے لگے تھے، اسی لیے انہیں اس کردار کی طرح موت مل جاتی ہے۔ یہ کہانی

Scanned by CamScanner

بنیادی طور پر اس بات کا اشارہ ہے کہ سچا آرٹسٹ وہی ہوتا ہے جو کسی کردار کو اپنی زندگی کا جزو بنا لیتا ہے۔ یہ کہانی ایک تہذیبی وقوعے کو پیش کرتی ہے۔ اس کہانی کا ایک تہذیبی زاویہ ہے۔ اس میں اپنی مٹی سے شدید محبت بھی پنہاں ہے اور اس تہذیبی روایت کا احساس بھی جو ہندوستان کی عظمت کا نشان ہے۔ یہ کہانی ہندوستانی تہذیب کی تلاش اور ثقافتی تشخص سے عبارت ہے۔ تہذیب سے گہری وابستگی اور اپنی زمین کا حصہ بننے کی خواہش ہے کہ لازوال وہی ہوتا ہے جو اپنی تہذیب کا حصہ بنتا ہے۔ اپنی تہذیب اور سنسکرتی سے جڑا ہوا فنکار ہی امر ہو سکتا ہے:

''اگلے ایک موقع پر کہنے لگے سو سال سے مطلب گنتی کے سو سال نہیں ہوتے۔ اس کا مطلب ہوتا ہے آدمی امر ہو جاتا ہے اس امرت سے!

وہ کون سا امرت ہے...؟ بہت دیر، بہت دور دیکھا بملدا نے! اب سوچتا ہوں تو لگتا ہے شاید جانتے تھے کہ انہیں کینسر ہے۔ بولے ''تہذیب! سنسکرتی! میں اس زمین کی تہذیب کا حصہ بن جانا چاہتا ہوں تا کہ...'' کہنا چاہتے تھے ''تا کہ زندہ رہوں لافانی ہو جاؤں'' پر کہا نہیں''

اس کہانی میں داخلی احساس کی بڑی خوب صورت فضا ہے—

سن سیٹ بولیوارڈ—: فلمی زندگی کی ایک reality کو پیش کرنے والی یہ کہانی جس جملے سے شروع ہوتی ہے اسی جملے پر ختم بھی ہوتی ہے:

''پوسٹ مارٹم کے وقت بھی وہ وزیٹنگ کارڈ لاش کی مٹھی میں بھینچا ہوا تھا۔''

اس میں شاید کوئی رمز ہے۔ کہانی ایک بوڑھی گلیمر زدہ ہیروئن چارولتا کی ہے جو اپنی عمر کے آخری لمحے میں بھی اسی انداز و اطوار سے جیتی ہے جس طرح اپنی جوانی، شہرت، اور گلیمر کے خوبصورت دنوں میں تھی۔ مگر ایک دن اچانک اسے احساس ہوتا ہے کہ اب اس کی کوئی آرٹسٹک حیثیت نہیں رہی بس اسی دن اس کی موت ہو جاتی ہے۔ جذبات و احساسات کی ناقدری اور حقیقی شناخت سے ایک آرٹسٹ کی محرومی ہی اس کی موت کا باعث بن جاتی ہے۔ ایک طربیہ کردار، اچانک المیہ کردار میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس کہانی کا بنیادی تھیم identity crisis ہے یعنی شناخت کا بحران۔

مائیکل اینجلو—: اس کہانی میں گہری رمزیت ہے اور اسراریت کی تہیں بھی۔ چہروں کی یکسانیت میں ایک نیا چہرہ تلاش کرنے کی کوشش مگر ہر چہرہ پرانے چہرہ کا ہی عکس نظر آتا ہے۔ اس کہانی کا آخری جملہ ''میں وہی یسوع ہوں جسے تم یہودہ نقش کر رہے ہو'' کہانی کی کلید ہے۔ اس سے اس کہانی

Scanned by CamScanner

کا سارا منظر نامہ روشن ہو جاتا ہے۔ اس جملے کو ان جملوں کے ساتھ ملا کر دیکھیں کہ ''روم میں چہرے نہیں ملتے۔ چہروں پر کردار نہیں ملتے۔ سب ایک سے ہی لگتے ہیں'' تو بات واضح ہو جائے گی۔ دراصل چہروں کی شناخت اور کردار کی تلاش ہی مصور کا بنیادی عمل ہے۔ پتہ نہیں کون سا کردار کب کون سا چہرہ، اوڑھ لے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ایک یسوع بڑھتی عمر کے ساتھ یہودہ بن جاتا ہے۔ اور ایک ماں، مریم بنتے بنتے رہ جاتی ہے۔ انسان فطری طور پر معصوم ہوتا ہے۔ زمانہ اور حالات اسے عیار اور مکار بنا دیتے ہیں۔ اس کہانی کے اعماق میں اتر کر دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ مائیکل اینجلو جو کہ مشہور مصور ہے، نے مریم کا ماڈل تو ماں سے لے لیا تھا مگر پھر بھی ماں مریم نہ تھی کیونکہ اس کو احساس تھا کہ اس کا باپ ہر وقت شراب میں دُھت رہتا تھا اس لیے وہ کہتا ہے کہ ''باپ اگر تو یہ نہ ہوتا تو ماں مریم ہوتی۔''

اس کہانی میں بنیادی اشارہ یہ ہے کہ ہر بڑا فنکار، تخلیق کار نئے جزیروں کی تلاش میں رہتا ہے، نئے نئے تجربات کرتا ہے۔ اگر وہ خود کو دہرا رہا ہے تو وہ بڑا فنکار نہیں۔ ایک سچا فن کار ہمیشہ تخیلات کے نئے آسمان اور نئی زمین دریافت کرتا ہے۔

کس کی کہانی—: یہ گلزار کے تخلیقی تصورات، محرکات اور احساسات کا عکس نامہ ہے۔ اس کہانی میں دراصل گلزار نے ادب کے تئیں اپنے ذہنی رویے اور تخلیقی تجربے کا اظہار کیا ہے۔ اپنے تخلیقی شعور کا سراغ دیا ہے۔ اس کہانی میں ادب اور سماج کے رشتے کو واضح کیا گیا ہے۔ گویا گلزار کا نظریہ، ادب برائے زندگی کا ہے۔ جب سماج نے ترقی نہیں کی تو وہ ادب جو سماج کا آئینہ دار کہلاتا ہے، وہ کیسے ترقی کر سکتا ہے۔ اس کہانی میں سماج اور ادب کے گہرے داخلی و خارجی ارتباط کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ جن کرداروں کی کہانیاں بیان کی جاتی ہیں، وہ کردار ترقی نہیں کرتے تو پھر کہانی کیسے ترقی کر سکتی ہے۔ جب سماج ہی زوال پذیر ہو تو ادب کیسے ترقی پذیر ہو سکتا ہے؟ کہانی کا ایک کردار کہتا ہے کہ ''جن کی کہانی لکھتے ہو وہ تو وہیں کے وہیں پڑے ہیں۔ میں اپنے باپ کی جگہ بیٹھا ہوں اور آپ اپنے بھائی صاحب کی بیٹھک چلا رہے ہیں۔ ترقی کون سی کہانی نے کر لی''— گھسیٹا موچی کا یہ جملہ کہانی کے افادی تصور، سماجی معنویت، مقصدیت اور گلزار کے تخلیقی شعور و عمل کو اجاگر کرتا ہے۔

اُدھا—: چھوٹے چھوٹے ہاتھوں اور چھوٹی چھوٹی ٹانگوں والے بونے ادھا کی کہانی ہے جو بظاہر تو ناقص وجود نظر آتا ہے مگر باطنی طور پر مکمل ہے۔ سماج کی نظر میں وہ ادھا ہے مگر حقیقت میں وہی

Scanned by CamScanner

معاشرے کا پورا آدمی ہے۔ 'ادھا' ایک بہت ہی دلچسپ اور selfless کردار ہے۔ اس کی زندگی بھی نشیب و فراز سے گزرتی ہے۔ وہ بھی تالاب سے ندی، ندی سے دریا اور پھر سمندر بننے کے عمل سے گزرتا ہے۔ اس کے اندر بھی امنگوں کا سمندر اور آرزوؤں کا آسمان ہے۔ اَدھا ہونے کے باوجود اس کے پاس ایک دل گداختہ ہے۔ چھتر پور سوسائٹی کی ایک خوب صورت لڑکی رادھا کملانی کی وجہ سے اس کے دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہو جاتی ہیں۔ اس کے اندر بھی کچھ خواب پلنے لگتے ہیں۔ کچھ احساس جاگنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ محبت کے جذبے کے ساتھ ساتھ رقابت کا جذبہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ جب رادھا کملانی کی رات سہانی ہو جاتی ہے تو اَدھا کے وجود میں اندھیرا اترنے لگتا ہے اور وہ ستیہ جیسی اکیلی اور بدنام لڑکی کے فلیٹ میں جا کر اس کے بدن کی روشنی نچوڑنے لگتا ہے۔ ستیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے مگر ستیہ بھی اسے آدھا مرد ہی سمجھتی ہے۔ بالآخر ایک دن ستیہ حاملہ ہو کر ایک بچے کی ماں بن جاتی ہے اور جب اس کا پتہ سوسائٹی والوں کو چلتا ہے تو اس کا جینا حرام ہو جاتا ہے اور وہ زہر کھا کر خودکشی کر لیتی ہے۔ اب مسئلہ ستیہ کے بچے کی کفالت کا ہے۔ ساری سوسائٹی والے جمع ہیں مگر کوئی بھی اس بچے کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ اتنے میں اُدھا آتا ہے اور اس بچے کو اپنی بانہوں میں اٹھا لیتا ہے۔ تبھی پروفیسر کی آواز گونجتی ہے ''تم سب ادھورے ہو، آدھے ہو اور جسے تم ادھا کہتے ہو، دیکھو دیکھو وہ کتنا پورا ہے۔ مکمل ہے۔'' گلزار کی اس کہانی میں احساسات کی کئی پرتیں ہیں۔ پہلا احساس یہ کہ آدمی اپنے اعضا سے مکمل نہیں ہوتا بلکہ احساس سے ہوتا ہے۔ مکمل آدمی وہی ہوتا ہے جس کے اندر سچ کو اپنانے کی شکتی ہو۔ جو سماج اور معاشرے کے لعن طعن سے ڈرتا نہ ہو بلکہ اس سے آنکھیں ملانے کی قوت رکھتا ہو۔ مکمل انسان وہ ہوتا ہے جو سماج کو بدل سکتا ہو۔ وہ نہیں جس نے اپنے چہرے پر مکمل انسان کا مکھوٹا تو لگا رکھا ہے مگر اندر سے بزدل اور کائر ہے۔ اُدھا اس معنی میں ایک مکمل وجود ہے کہ اس نے سب کے سامنے ایک بہت بڑی تلخ حقیقت کو قبول کر لیا اور اس بچے کو اپنا لیا جو شاید اسی کی قوت مردانگی کا ثمرہ تھا۔

ایک چابی—: دل میں دھیمی دھیمی آگ جلانے والی ایک خوبصورت کہانی ہے۔ وہ آگ جو سینے میں پھیل کر بہت سے جذبوں کو جگا دیتی ہے۔ دل کے تار کو چھیڑنے والی اس کہانی کا محور عورت اور مرد کا رشتہ ہے۔ یہ ایک ایسی عورت کی کہانی ہے جو اپنے پاؤں میں کوئی زنجیر نہیں ڈالنا چاہتی۔ زندگی آزادی اور خود مختاری کے ساتھ گزارنا چاہتی ہے وہ اپنے inner space کی تلاش میں ہے۔ اس عورت کا شوہر سدھیر ہے۔ جس کے اپنے کچھ اصول ہیں اور زندگی گزارنے کے ضابطے۔ زندگی

Scanned by CamScanner

کے اصولوں سے انحراف انہیں کسی بھی صورت منظور نہیں۔ وہ اپنے ضابطوں کے اسیر ہیں۔ تھیٹر ہی ان کی زندگی ہے۔ مگر ان کی بیوی جو کہ تھیٹر کا حصہ ہے، تھیٹر کی بندھی ٹکی زندگی سے اوب جاتی ہے اور ایک آزاد فضا تلاش کرنے لگتی ہے۔ اس کی زندگی میں کمٹ منٹ کا کوئی تصور نہیں، اسے اسیری عزیز نہیں۔ وہ آزاد رہنا چاہتی ہے۔ (کبھی کبھی کپڑوں سے بھی آزاد) وہ گونگی گائے بن کر نہیں رہنا چاہتی۔ اس لیے دھیرے دھیرے اس کے اندر بغاوت کی چنگاری سلگنے لگتی ہے۔ بالآخر ایک دن سدھیر کا دوست ٹی کے، اس کی زندگی میں مسیحا بن کر آجاتا ہے اور وہ دھیرے دھیرے سیما کی زندگی میں مکمل طور سے دخیل ہو جاتا ہے۔ دونوں کے مابین تعلقات دوسرے حدود میں داخل ہو جاتے ہیں۔ دونوں کے عشق کی بھنک سدھیر کو مل جاتی ہے تو ایک ڈرامے کے سین کے ذریعے سدھیر اپنے جذبات کی ترسیل کرتا ہے۔ دونوں سدھیر کے اشاروں کو سمجھ جاتے ہیں اور سدھیر آخر کار اپنی شکست کو منطقی جواز عطا کرتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ "قانونی طور پر کوئی شوہر نہیں ہوتا۔ قانونی طور پر کوئی بیوی نہیں ہوتی۔ ہم خواہ مخواہ ان رشتوں پر قانونی مہریں لگاتے رہتے ہیں۔ ان مہروں سے راشن کارڈ بن سکتے ہیں رشتے نہیں بنتے۔" یہ کہانی نئے یگ میں عورت اور مرد کے مابین رشتوں کی نوعیت اور ماہیت کو اجاگر کرتی ہے۔ نئے زمانے میں رشتوں کی بدلتی معنویت کی طرف یہ خوبصورت اشارہ ہے۔ شادی جذبات احساسات کے اتصال اور ذہنی و جسمانی ہم آہنگی کا نام ہے۔ شادی دو روحوں کا ملن ہوتا ہے۔ قول و قرار، قاضی کے دو لفظوں یا سات پھیروں سے دو روحوں کو باندھا تو جا سکتا ہے اسے برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ اب نئے سماج میں شادی کے بہت سے متبادل آگئے ہیں۔ sense of togethr ختم ہو جائے تو پھر ایسی ہی صورت حال جنم لیتی ہے۔ ہمارے سماج میں extra marital affairs کا ناسور پھیل گیا ہے۔ other man, other women کا بھیانک سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ عورت اور مرد کے خواب بدل گئے ہیں۔ چنانچہ جب شادی ٹوٹ جاتی ہے تو پھر کہانی میں ایک نیا موڑ آتا ہے۔ old flame بھڑک اٹھتا ہے۔ پرانی chemistry لوٹ آتی ہے۔ سیما ایک دن سدھیر کے فلیٹ پہنچتی ہے اس کا حال دریافت کرنے تو کمرے میں کسی لڑکی کی آواز سنتی ہے۔ وہ نیچے پلٹ آتی ہے اور وہ چابی جو دونوں کے درمیان رشتے کے لمس کو برقرار رکھے ہوئے تھی، وہیں چھوٹ جاتی ہے۔ یہی چابی دونوں کے درمیان نقطہ اتصال تھی۔ مگر اب یہ نقطہ اتصال بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ کہانی میں گلزار نے بتایا ہے کہ کسی کے بغیر کسی کی زندگی ادھوری نہیں ہوتی۔ ہر شخص اپنی زندگی کی تکمیل کی راہیں تلاش لیتا ہے۔ کوئی نہ کوئی چیز زندگی کے خلا کو

Scanned by CamScanner

ضرور پر کر دیتی ہے۔ آج کے یگ کی عورت اور مرد دونوں ہی self-fulfilment کی راہ پر گامزن ہیں۔

دس پیسے اور دادی—: اس چھوٹی سی کہانی میں بہت ساری معنویت مضمر ہے۔ اس میں گہرے فلسفیانہ مسائل بھی ہیں۔ علم و عرفان اور ادراک کا دریا بھی رواں ہے۔ یہ کہانی ایک بچے کے ذہنی شعور کی بلوغت اور پختہ سوچ کی لکیروں کا ایک ایسا بیانیہ ہے کہ وہ بھگوان کے وجود پر ہی سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔ بھگوان کے جاگرت ہونے کا مذاق اڑاتا ہے اور مذہبی معاشرے کی دوہری سوچ اور دوہرے معیار کو بے نقاب کرتا ہے۔ یہ بچہ زندگی کی حقیقتوں اور گھر کے مفہوم سے نا آشنا ہے۔ وہ خود مختاری چاہتا ہے۔ گھر سے بھاگ جاتا ہے مگر ایک ریلوے اسٹیشن پر بھکارن بوڑھی کی اکڑی ہوئی لاش دیکھ کر اسے اپنی دادی کی یاد آجاتی ہے اور وہ گھر لوٹ آتا ہے۔ اس کہانی میں دس پیسہ کہانی کی معنویت کو آشکار کرتا ہے۔ جب وہ بچہ اس بوڑھی بھکارن کے یہاں سے دس پیسے چرا لیتا ہے تو پھر بھیڑ کو دیکھ کر وہ دس پیسے واپس کر دیتا ہے اور یہ اس کے احساس میں یہ بات جاگزیں ہو جاتی ہے کہ مرنے کے بعد بھی پیسوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ دادی ماں پیسے اس لیے کفایت شعاری سے جمع کرتی ہیں کہ ان کی موت کے بعد ان کی چتا کو آگ لگائی جا سکے۔

ڈلیا—: جاگیردارانہ استحصال کی کہانی ہے۔ ڈلیا ایک ایسا کردار ہے جو اکثر جاگیردارانہ سماج کی قربان گاہ کی بھینٹ چڑھتا رہتا ہے۔ چھوٹی ذاتوں کا بڑی ذات کے لوگ کس طرح استحصال کرتے ہیں، اس کا ایک رنگ اس کہانی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کہانی میں ایک حویلی ہے جس کے پیٹ میں نہ جانے کتنی جوانیاں سما چکی ہیں۔ نیتی کا یہ ڈائیلاگ حویلی کی دوغلی زندگی اور استحصالی رویے پر بہت گہرا طنز ہے کہ "میں بھی ایسے ہی آئی تھی بڑے مہاراج کے پاس اور یہیں رہ گئی حویلی میں۔ واپس جانے کو کچھ بچا ہی نہیں۔ کچھ چھوڑا ہی نہیں مہاراج نے۔ چل اٹھ بدل لے چولی۔" یہ حویلی کا عام نقشہ ہے جہاں چھوٹے چھوٹے گھر کچے مکان اپنے مکینوں کے ساتھ کھو جاتے ہیں۔ اس کہانی میں علاقائی زبان کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ دیہی معاشرے کی تصویر کشی اور وہاں کا خوبصورت منظر نامہ ہے۔ گلزار نے کہانی کے تقاضے کے مطابق زبان استعمال کی ہے اور اچھی منظر نگاری کی ہے۔

خوف—: فسادات کی کہانی ہے۔ فسادات کے دوران خوف کی نفسیات کس طرح کی شکلیں اختیار کرتی ہے، اس کا خوبصورت اور پر اثر بیان ہے۔ ذہن پر فسادات کے پڑنے والے منفی اثرات، ذہن پر چھا جانے والی تاریکیاں، تشکیک کی پرچھائیاں، اس کہانی کے بنیادی احساسات ہیں۔ کہانی

Scanned by CamScanner

ایک خالی سنسان ٹرین میں سوار یاسین نامی شخص سے شروع ہوتی ہے جو ٹرین کے ڈبے میں اکیلا ہے کہ اچانک دوسرے آدمی کی موجودگی اس کے اندر خوف و ہراس پیدا کر دیتی ہے۔ پھر خوف کا دباؤ اور حالات ایسے بنتے ہیں کہ قبل اس کہ وہ شخص اسے مار دے وہ دوسرے اجنبی شخص کو باہر پھینک دیتا ہے اور دوسرا شخص 'اللہ' کہتا ہوا نیچے گر پڑتا ہے۔ یاسین کو حیرت ہوتی ہے مگر خوف نے جس نفسیاتی ماحول کو جنم دیا ہے، اس میں ہندو مسلمان کی تقسیم بے معنی ہو جاتی ہے۔ فسادات میں اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ دراصل خوف کی نفسیات ہے جس کے تحت ایسی حرکتیں وقوع پذیر ہوتی ہیں کیونکہ ایسی سچویشن میں ہر ذہن میں شک کا ناگ پھن پھیلائے رہتا ہے اور تشویش کے سانپ سرسراتے رہتے ہیں۔ گلزار نے اس کہانی میں فساد کی ہولناک تصویر کے ساتھ اس خوف کو اپنا موضوعاتی محور بنایا ہے، بے بنیاد خوف کو، جس خوف کی آگ پھیل کر بستیوں اور شہروں کو تاراج کر دیتی ہے۔

سانجھ —: بظاہر تو معمولی سی کہانی لگتی ہے مگر اس کے باطن میں احساسات کی جو لہریں موجزن ہیں انہیں محسوس کرنے کے بعد کہانی بڑی ہو جاتی ہے۔ ایک مرد جب آہستہ آہستہ اپنا ادھیکار کھونے لگتا ہے تو اس کے مردانہ وقار اور انا کو ٹھیس لگتی ہے، چاہے وہ مرد اپنی زندگی کی آخری منزل ہی میں کیوں نہ ہو۔ پھر بھی اسے اپنے مردانہ وقار کا احساس رہتا ہے:

> "باتیں بڑی معمولی ہیں بیٹا، نہ ہونے سے کوئی دنیا ادھر کی اُدھر نہیں ہو جاتی۔ لیکن زندہ رہنے کا رس بنا رہتا ہے بس۔ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے سے بیگانے تو نہیں ہو گئے۔"

بات صرف اتنی سی تھی کہ لالائن نے لالہ جی سے پوچھے بغیر اپنے بال کٹوا لیے۔ وہ بال جو لالہ جی کو بہت پسند تھے، خوبصورت لمبے بال... بس اسی ایک سانحے نے لالہ جی کو اندر سے افسردہ کر دیا۔ وہ لالائن سے کٹے کٹے سے رہنے لگے۔ بالآخر وہ ایک دن اپنی بیٹی کے یہاں جانے کو نکلے تو نہ اپنی بیٹی تک پہنچ سکے اور نہ اپنے گھر ہی واپس لوٹ سکے۔ ان کا آشرم میں دیہانت ہو گیا۔ جہاں وہ مکمل طور سے سنیاسی بن گئے تھے۔ لالائن کے بال کٹوانے نے ان کے دل پر اتنا گہرا اثر کیا کہ وہ دنیا سے بے زار ہو گئے۔ دراصل بال کٹوانا ودھوا ہونے کی ایک علامت ہے۔ اس لیے جب لالائن نے اپنے بال کٹوا لیے تو لالہ جی کی مردانگی متاثر ہوئی اور انہوں نے سوچا کہ میں تو جیتے جی مر گیا۔ اس لیے اپنی زندگی میں ہونے والی اس موت کے صدمے کو وہ برداشت نہیں کر سکے۔ لالہ جی بنیادی طور پر روحانی قدروں اور رسومات کے آدمی تھے۔ اس لیے وہ تجدد کی ہر اس لہر اور modernity کے خلاف تھے جس سے اپنی ثقافتی جڑیں متاثر ہوتی ہیں۔

Scanned by CamScanner

مرد—: عورت مرد کے جذباتی رشتوں کے انقطاع اور اتصال کی کہانی ہے۔ مرد کی مطلق العنانیت، خود مختاریت اور عورت کی مظلومیت کے محور پر یہ کہانی گھومتی ہے۔ اس کا مرد کردار بخشی ہے جس کی زندگی میں کانتا نامی ایک عورت آتی ہے تو بسا بسایا ایک گھر اُجڑ جاتا ہے اور اس گھر کے اجڑنے کا اثر بچے پر نہ پڑے، اس لیے ماں باپ اپنے بیٹے کو ہاسٹل میں داخل کروا دیتے ہیں۔ دونوں کے درمیان بچہ ہی رابطے کا ایک پل ہے یہی بچہ ہے جس کی وجہ سے دونوں کے درمیان جذبوں کی کچھ چنگاریاں باقی ہیں۔ بخشی کی زندگی میں جہاں کانتا آجاتی ہے وہیں رما کی زندگی میں رمن کمار آجاتا ہے اور رمن کمار سے لطف وصال کے نتیجے میں رما کا پیٹ بڑھ جاتا ہے۔ رما کوشش کرتی ہے کہ اس سانحے کا علم اس کے بچے کو نہ ہو، تاکہ اس کے ذہن پر کوئی منفی اثر نہ پڑے۔ مگر رما کی ہر کوشش ناکام ہو جاتی ہے اور بچہ یہ جان لیتا ہے کہ اس کی ماں کے پیٹ میں کسی کا بچہ پل رہا ہے۔ اس کا ذہنی توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ باپ کی طرح برتن توڑنے لگتا ہے اور ماں سے پوچھتا ہے۔ "کس کا بچہ ہے۔ رمن انکل کا— باسٹرڈ!" اس وقت ماں کو ایسا لگتا ہے جیسے اس کا بیٹا نہیں خاوند بول رہا ہے۔ عورت یہاں مظلومیت کی ایک تصویر نظر آتی ہے۔ مرد چاہے جتنی عیاشی کرے لیکن اگر عورت اپنی زندگی کے خلا کو پر کرنے کی کوشش کرے تب بھی وہ مورد الزام ٹھہرائی جاتی ہے۔ اس کہانی میں گلزار نے آج کی سماجی زندگی کے ایک بڑے سچ کو پیش کیا ہے۔ گلزار نے یہ ظاہر کیا ہے مرد چاہے بچہ ہو، جوان ہو یا بوڑھا اس کی فطرت نہیں بدلتی۔ اس کی نفسیات وہی ہوتی ہے حاکمیت کی، اور وہ ہر صورت میں اور ہر گناہ کے لیے عورت کو ہی سزاوار ٹھہراتا ہے۔ یہ child awareness کی بھی ایک جہت کو آشکار کرتی ہے کہ ہمارے عہد کا بچہ، شعوری اور فکری اور جنسی طور پر بالغ ہو چکا ہے۔ اسے سارے درون خانہ راز کا علم ہے۔

راوی پار—: گلزار کا انتہائی حساس تخلیقی اظہار ہے۔ اس کہانی کا کردار درشن سنگھ ہے جو موج حوادث میں گھرا ہوا ہے۔ پے بے پے حادثات نے اس سے حواس چھین لیے ہیں۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ملک تقسیم ہو رہا تھا، دلوں کے ٹکڑے ہو رہے تھے، خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں، خوف و ہراس، سراسیمگی کا تسلط تھا۔ پاؤں تلے سے زمینیں کھسک رہی تھیں۔ آسمانوں سے خوف کی موسلا دھار بارشیں ہو رہی تھیں۔ ایسے حالات میں درشن سنگھ اپنی زمین اور اپنی جڑوں سے ہجرت پر مجبور ہوئے اور وہ بھی اپنی بیوی شانتی کے دو نومولود جڑواں بچے کے ساتھ— ٹرین کھچا کھچ بھری ہوئی ہے۔ تل دھرنے کی بھی جگہ نہیں ہے لیکن سفر کرنا ہے اس لیے وہ چھت پہ بیٹھ جاتے ہیں۔ ٹرین کئی

Scanned by CamScanner

نئے علاقوں سے گزرتی ہے۔ جوں جوں ہندوستان کے قریبی شہر آتے جاتے ہیں، لوگوں کے دلوں میں جوش و ولولہ بڑھتا جاتا ہے۔ اسی دوران ایک جڑواں بچے کی حرکت قلب بند ہو جاتی ہے۔ جب راوی آتا ہے تو درشن سنگھ کو مسافر دوست بچے کو راوی میں پھینک دینے کا مشورہ دیتے ہیں۔ درشن سنگھ بچے کو پھینک دیتا ہے اور پھر اپنے دوسرے بچے کی طرف پلٹتا ہے تو دیکھتا ہے کہ مردہ بچہ شاہنی کی چھاتی سے لپٹا ہوا ہے اور زندہ بچہ راوی کی لہروں میں کھو گیا ہے۔

تقسیم کے المیے پر لکھے گئے افسانوں میں یہ افسانہ ایک انتہائی مہذب افسانہ ہے جس میں تخلیق کار نے نفس واقعہ کو بیان کر دیا ہے۔ اپنے کسی غم غصہ یا خفگی کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اس راست اظہار میں بہت ساری سچائیاں چھپی ہوئی ہیں۔ راوی میں زندہ بچے کو پھینک دینا اور مردہ بچے کا چھاتی سے چمٹے رہنا زندہ قدروں کو چھوڑ کر مردہ قدروں کو اپنے سینے سے لگانے کا اشارہ ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو شاہنی یہاں ممتا کی ایک علامت ہے۔ ایک ماں جو اپنے دونوں جڑواں بچے کو چھاتی سے چمٹائے ہوئے ہے۔ یہ شاہنی مادر وطن بھی ہو سکتی ہے جس کے دو جڑواں بچے ہیں۔ ایک ہندو، ایک مسلمان۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو 'راوی پار' کا فکری اور فنی افق بہت وسیع ہو جاتا ہے۔

راوی ایک علامت ہے وقت کے بہاؤ کی، زندگی کی، زندگی کی قدروں کی جسے بہت پیچھے چھوڑ دیا گیا ہے۔ راوی پار ایک انتہائی حساس اور بہترین کہانی ہے۔

فصلــــ: گلزار کی یہ کہانی پڑھ کر بلا وصل خلیل جبران کی کئی کہانیاں یاد آ گئیں۔ یہ کہانی جاگیردارانہ نظام کے خلاف ہے۔ ایک ایسے زرعی معاشرے کی کہانی جہاں سرمایہ دار، کسانوں کا استحصال کرتے ہیں۔ اس کہانی میں طبقاتی عدم مساوات اور جبر کے خلاف ایک للکار ہے۔ ٹھاکر ہرنام سنگھ، جاگیرداری کی ایک علامت ہے۔ اس کے خلاف ایک انقلابی کردار نعرہ بغاوت بلند کرتا ہے اور اس کی پاداش میں سارے آلام اور مصائب برداشت کرتا ہے۔ اذیتیں سہنے کے باوجود اس کا بس ایک ہی خواب ہے کہ کسانوں کو اس کا حق ملے۔ فصل اس کے حصے میں آئے، جو اس کا اصلی امین ہے۔ اس کہانی کا انقلابی کردار دانی رام ہے۔ گلزار نے آخر تک اس کردار کا نام پردۂ خفا میں رکھا۔ واحد غائب کے ذریعے پوری کہانی بیان ہوتی رہی مگر جانے کیا مجبوری آن پڑی کہ گلزار نے واحد غائب کو واحد حاضر میں بدل دیا۔ کہانی اگر واحد غائب میں ہی ہوتی تو کہانی کا تاثر اور گہرا ہوتا۔ اس کردار کو غیاب سے ظہور میں لا کر گلزار نے پتہ نہیں کس رمز کو آشکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر یہ

Scanned by CamScanner

کردار بے نام ہوتا تو بہتر ہوتا۔ کیونکہ انقلابی کردار کا کوئی بھی نام نہیں ہوتا۔ انقلاب تو ایک تسلسل اور تحرک کا نام ہے اور انقلابی ہمیشہ بے نام ہی ہوتا ہے۔

یہ محمد ہوسکتا ہے۔ امیر صادق یا حسن ہوسکتا ہے
ان میں سے کوئی بھی ہوسکتا ہے
یا ایسے ہی ہزاروں ناموں میں سے کوئی ایک نام
آزادی کے سپاہی کا کوئی نام ہوسکتا ہے۔

(تازی علوش)

دھواں—: یہ کہانی مذہبی مشروطیت کے مکروہ چہرے کو بے نقاب کرتی ہے۔ مذہبی آتش فشانی کے خلاف یہ انسانیت پسند سوچ کا ایک روشن نقطہ ہے۔ مذہبی مشروطیت، انسانی خود مختاری اور انفرادی حق کو کس طرح سلب کر لیتی ہے اور ایک انسان کی آرزو، امنگ، خواہش کیسے مذہبی فرامین کی صلیب پہ لٹکتی ہے اور کیسے مذہبی جبر اپنے جبڑے میں معصوم آرزوؤں اور امنگوں کا گلا گھونٹ دیتا ہے۔ یہی سب کچھ بیان کرتی ہے یہ کہانی۔ انسانی آرزوؤں کو قید سلاسل میں جکڑنے والی مذہبیت نے منافرت کی تخم کاری کی ہے اور انسانوں کو کئی ٹکڑوں اور حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ مذہب کی اساس پر انسانی تقسیم کے بھیانک رویے سے جو آگ اٹھتی ہے، وہ آگ پوری بستی کو جلا کر تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ کہانی ایک چودھری کی موت اور اس کی وصیت سے شروع ہوتی ہے کہ انہیں دفن کرنے کے بجائے چتا پر رکھ کر جلایا جائے اور ان کی راکھ کو گاؤں کی ندی میں بہا دیا جائے جو ان کی زمین سینچتی ہے۔ چودھری رواداری کی ایک علامت ہے جن کا ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے گہرا رشتہ تھا اور دونوں فرقے کے لوگ ان سے بیحد عقیدت رکھتے تھے۔ چودھری کی اس وصیت نے سبھی کو دھرم سنکٹ میں ڈال دیا تھا۔ ملا بھی، پنڈت بھی، سبھی پریشان تھے کہ آخر کیا کیا جائے۔ ایسے حالات میں جب ہندو کچھ زیادہ ہی ہندو ہو گئے تھے، مسلمان کچھ زیادہ مسلمان— اس وصیت نے آگ پہ تیل چھڑکنے کا کام کیا۔ اگر چودھری کو دفن کرتے ہیں تو ان کی آخری خواہش کی نفی اور توہین ہوتی ہے اور اگر جلاتے ہیں تو مذہب کی نفی ہوتی ہے۔ وصیت اور مذہب کی اس کشمکش نے بالآخر بھیانک صورت اختیار کر لی۔ ایک سیدھی سادی انسانی خواہش، مذہب، قوم اور عقیدے کی آمریت اور جبریت کی بھینٹ چڑھ گئی۔ کہانی کا کلائمکس بڑا پُر اثر اور درد سے بھرا ہوا ہے:

Scanned by CamScanner

زندہ جلا دیے گئے تھے
اور مردہ دفن ہو چکے تھے

یہ ہماری مذہبی سوچ کی دقیانوسیت اور تشدد پسند مذہبی معاشرے کا ایک انتہائی بھیانک چہرہ ہے جسے گلزار نے اپنی کہانی میں پیش کیا ہے اور یہ مذہب کی غیر انسانی تعبیر و تفہیم پر بہت گہرا طنز بھی ہے۔

تقسیم—: ایک المیاتی کہانی ہے۔ تقسیم نے جانے کیسی کیسی کہانیاں جنم دیں اور کہانیوں کو کیسے کیسے موڑ دیے۔ اس المیے نے درد کے بہت سے رشتوں کو جگا دیا اور کچھ نئے رشتوں کو جنم بھی دیا۔ کھوئے ہوؤں کی جستجو نے انسانوں کو اجنبیوں تک پہنچایا۔ تقسیم کے المیے نے بہت سارے نام بدل دیے، قومیت بدل دی، مذہب بدل دیے، ان ساری بدلی ہوئی شکلوں میں بھی لوگ اپنے اپنوں کو کھوجتے تھے اور جہاں کہیں نام یا شکل کی مشابہت مل جاتی تو یوں سمجھنے لگتے جیسے کھوئی ہوئی چیز مل گئی۔ یہ کہانی المیہ تقسیم سے پیدا ہونے والی مختلف ذہنی کیفیات اور تاثرات کا بیان ہے۔ کھوئے ہوئے رشتوں کی بازیابی، اس کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ یہ کہانی انسانی احساسات کی کئی سطحوں کو مس کرتی ہوئی سیدھے دل میں اُتر جاتی ہے۔ یہ کہانی المیوژن پر مبنی ہے۔ اب بھی تقسیم کے المیے کے شکار لوگ اسی المیوژن کے شکار ہیں۔

نجوم—: ایک ایسی کہانی ہے جس میں انسانی رفعت کی کہانیاں ستاروں کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ ستاروں کے سقوط اور ستاروں کے ظہور سے کسی بڑے انسان کی موت یا کسی انسان کی عظمت و رفعت کے مدارج کا تعین کیا جاتا ہے۔ یہی اس کہانی کا بنیادی تھیم ہے کہ ستاروں کی درخشندگی میں انسانوں کی تابانی مضمر ہے اور ستاروں کی گردش سے ہی تقدیریں بدلتی ہیں۔ اس کہانی میں دکھایا گیا ہے کہ فلک پہ ایک ستارہ ہے۔ اس ستارے کا غیاب ہوتا ہے تو بہادر شاہ ظفر کے استاد ذوق کی موت ہو جاتی ہے اور پھر اسی جگہ سے ایک اور ستارہ طلوع ہوتا ہے تو مرزا اسد اللہ خاں غالب، بہادر شاہ ظفر کے استاذ مقرر ہوتے ہیں۔ اختر شناسی کے سلسلہ کی یہ کہانی گلزار کی منفرد کہانیوں میں سے ایک ہے۔

نو وارد—: تازہ خیال پر مبنی شکست خواب کی کہانی ہے۔ کہانی کا منشا یہ ہے کہ نئے یگ میں بھی لوگ ستاروں اور astronomy کے چکر میں پڑ کر خواب و خیال کی حسین دنیائیں آباد کر لیتے ہیں مگر ان کا خواب، خواب ہی رہتا ہے، حقیقت نہیں بن پاتا اور جب خواب ٹوٹتے ہیں تو دلوں کے

Scanned by CamScanner

اندر مایوسیوں کے اندھیرے پیوست ہو جاتے ہیں۔ یہ نئے معاشرے میں پھیلتے ہوئے ترقی پذیر اندھ وشواس کی کہانی ہے کہ لوگ اپنی قسمت کی ریکھائیں آسمانوں اور ستاروں میں تلاش کرتے ہیں۔ جب کہ قسمت کا معاملہ کچھ اور ہے۔ اس کہانی میں ستاروں پر حد سے زیادہ اعتقاد اور پھر اس کا یقین ٹوٹ جانا اس بات کا مظہر ہے کہ پیشین گوئیاں اور یہ ستارے کچھ نہیں ہیں۔ اصل چیز ہے قوت ارادی، قوت عمل — تعلیم یافتہ باشعور طبقے میں اندھ وشواس کا پھیلتا جال، یہ اس کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ اس کی کنواری کنیا میں جس نووارد کی بشارت ستاروں نے دی تھی، وہ نووارد بیوی نہیں بلکہ نوکر تھا۔ کنواری کنیا کے رنگ تو بدل گئے مگر اس کردار کی تقدیر نہیں بدلی۔ کنیا کنواری ہی رہی اور کردار بھی۔

گڈی—: ایک بہت پیاری سی کہانی ہے جو خواب اور حقیقت، فنتاسی اور reality کے امتزاج کو ابھارتی ہے۔ اس کہانی میں دکھایا گیا ہے کہ خواب اور حقیقت کا جب ٹکراؤ ہوتا ہے تو کیا ذہنی کیفیت ہوتی ہے۔ گڈی ایک چھوٹی سی لڑکی ہے مگر اس نے چھوٹی سی عمر میں اپنا ایک آئیڈیل محبوب تلاش کر لیا ہے۔ وہ آئیڈیل فلمی اداکار دلیپ کمار ہے۔ جس سے گڈی بے انتہا پیار کرتی ہے اور اسے اپنا سچ مچ کا محبوب سمجھنے لگتی ہے۔ اس کے اندر وہی معشوقانہ انداز اور رقیبانہ اطوار پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ بھی ایک معشوق کی طرح چاہتی ہے کہ اس کا آئیڈیل صرف اسی کا ہو۔ وہ کسی اور کی نرم آغوش یا گرم بانہوں میں نہ ہو۔ لیکن جب وہ اپنے آئیڈیل کو وجینتی مالا کے ساتھ دیکھتی ہے تو اس کا سارا رومان چکنا چور ہو جاتا ہے۔ وہ ڈائری میں رکھی دلیپ کمار کی تصویریں پھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ یہ کہانی شکستگی خواب کی کہانی ہے۔ جب گڈی کو اپنا آئیڈیل نہیں ملتا تو وہ رونے لگتی ہے۔ اس کہانی کا کردار گڈی کم سنی کے باوجود اپنے آپ کو عاشقی کی منزل میں سمجھتی ہے اور وہی انداز اپناتی ہے جو بڑی عمر کی لڑکیوں کا ہوتا ہے۔ فراک نہیں، ساڑی پہننا چاہتی ہے۔ وہ گھنٹوں سنگار کرتی ہے اور اس طرح وہ اپنے آپ کو اپنے آئیڈیل کی معشوق کے روپ میں دیکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ لیکن جب گڈی کو فلمی پردے اور زندگی کی حقیقتوں کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنے رویے سے باز آتی ہے اور وہ بھی بے زاری کے ساتھ کہتی ہے کہ "جاؤ اپنی دھنو کے پاس" معصوم شیفتگی infatuation کا یہ وہ المیہ ہے جسے گلزار نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

خیرو—: یہ ایک معمولی کردار کی کہانی ہے جو بے عملی کی علامت اور بے کاری کا مظہر ہے۔ آوارہ گردی اس کا واحد شغل ہے۔ کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ رات کو اپنی آواز کے ذریعے لوگوں کو جگاتے رہنا

Scanned by CamScanner

ہی اس کا مشغلہ ہے۔ وہ بیکار کے کاموں میں زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ ایک دن ایسا ہوتا ہے کہ خیرو کہیں نظر نہیں آتا۔ لوگوں کو اس کی کمی شدت سے محسوس ہونے لگتی ہے اور پھر یوں ہوتا ہے کہ "وہ کام جو کبھی نہیں رکا تھا آج قدم قدم پر رک کر انتظار کر رہا تھا۔ خیرو کا نام جیسے ہونٹوں سے اٹھ کر آنکھوں میں آ گیا۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ چوپال پر بس اکیلا جھولا لٹکا ہوا تھا اور اس کی آواز کے بغیر سارا گاؤں جاگ رہا تھا۔"

ایک معمولی انسان بنیادی طور پر غیر معمولی ہوتا ہے۔ اس کی قدر و قیمت اس وقت سمجھ میں آتی ہے جب وہ نگاہوں سے دور ہو جاتا ہے۔ ایک بے مصرف آدمی کا بھی بہت سا مصرف ہوتا ہے۔ خیرو کی وجہ سے اس بستی میں کتنی گہما گہمی اور رونق تھی اور ان کی زندگیوں میں اس کا کتنا حصہ تھا اور خیرو میں کتنی خوبیاں تھیں۔ یہ اس وقت لوگوں کی سمجھ میں آیا جب خیرو منظر نامے سے غائب ہو گیا۔

لیکن ــــ: ایک داخلی سائیکی کا بیانیہ ہے۔ اس میں illusion of reality کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک ایسے انسان کی کہانی جس کے تحت الشعور میں شاید کسی بھیانک واقعے کی یاد تازہ ہے جو بار بار اسے haunt کرتا ہے۔ اس کہانی کا کردار دیوراج ایک بوڑھا انسان ہے۔ جو ہر شام کو ٹہلنے کے لیے ایک سنسان ریلوے اسٹیشن پر آتا ہے۔ ایک ایسے ریلوے اسٹیشن پہ جہاں گاڑی نہیں آتی۔ مگر پہلے کبھی آیا کرتی تھی اور سات پچاس پر آیا کرتی تھی اور اسی سات پچاس والی گاڑی سے ایک آدمی کی موت ہو جاتی ہے۔ وہ بوڑھا سوچتا ہے کہ یہ اس کے بیٹے کی لاش ہے۔ پھر بھی وہ اپنے بیٹے کا انتظار کر رہا ہے۔ اس بوڑھے انسان کی زندگی کا فلسفہ مختلف ہے۔ ایک دن بوڑھا غائب ہو جاتا ہے۔ بعد میں پتہ چلتا ہے کہ وہ تین سال پہلے اڑن اسٹیشن پر خود گاڑی کے نیچے آ کے کٹ گئے تھے۔ یعنی ماضی کا ایک واقعہ اس کے ذہن پر حاوی تھا اور ایک واہمہ اس طرح غالب تھا کہ وہ اس کے لیے حقیقت بن گیا۔ واہمہ کس طرح حقیقت بنتا ہے اور حقیقت کس طرح واہمہ ــــ اس کی ایک مثال ہے یہ کہانی۔ کیونکہ سات پچاس کی گاڑی سے جس کی موت ہوئی تھی، وہ اس بوڑھے کا بیٹا شیام نہیں بلکہ کوئی اور تھا۔ یعنی جس کی موت کا واہمہ تھا وہ تو زندہ ہے اور یہ واہمہ اس بوڑھے کی زندگی کا حصہ بن گیا۔ کہانی اپنے اندر بہت سارے اسرار سموئے ہوئے ہے۔

اونچی ایڑی والی میم ــــ: عنوان سے بظاہر ایسا لگتا ہے کہ اس میں شہر کی کسی شہناز لالہ رخ کا بیان ہوگا، کسی چلبلی، شوخ، ہائی اسٹینڈرڈ، ہائی کلاس، hip hop لڑکی کا ذکر ہوگا لیکن اس کہانی میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس اونچی ایڑی والی میم کا کوئی حقیقی وجود نہیں ہے، صرف ایک موہوم تصور ہے

Scanned by CamScanner

اور یہی موہوم تصور دو دوستوں کے مابین رقابت کا سبب بھی بن گیا ہے۔ جھبا اور مہکو، دو دھوبی دوست ہیں۔ دونوں گاؤں میں دوست کی طرح رہتے تھے۔ ایک ساتھ کھیلتے کودتے تھے۔ مگر مہکو بامبے آجاتا ہے اور یہاں کے شہری اطوار اپنا کر جب گاؤں جاتا ہے تو اپنے دوستوں پر دھونس جماتا ہے اور گاؤں والوں کو گنوار سمجھتا ہے۔ اسی دوران جھبا بھی گاؤں سے شہر آجاتا ہے۔ اس کے اندر گاؤں کا خلوص اور سادگی ہے، اس لیے لوگ اسے زیادہ چاہتے ہیں، پیار کرتے ہیں، بخششوں سے نوازتے ہیں، عنایتوں کی بارش کرتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مہکو اندر ہی اندر جلنے لگتا ہے اور جھبا کو ہر طرح کا نقصان پہنچانے اور اس کے قدم اکھاڑنے کی شطرنجی چالیں چلنے لگتا ہے۔ دراصل مہکو بٹو جلا ہے کی بیٹی پچھی کو حاصل کرنے کے چکر میں بھیا اسٹائل مارتا ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے جھبا کی ترقی دیکھ کر اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ پچھی اب اس کی زندگی میں نہیں آپائے گی۔ جھبا کو جب پارسی سیٹھ انعام میں سائیکل دیتا ہے تو مہکو کو ایسا لگتا ہے جیسے اسے سائیکل نہیں، پچھی مل گئی ہے اور اب وہ اونچی ایڑی والی میم بن گئی ہے جو اس کا منہ چڑا رہی ہے۔ اس کہانی میں گاؤں کی سادگی کو شہر کی عیاری کیسے نگل جاتی ہے، اس کا بھی بیان ہے۔ اونچی ایڑی والی میم دراصل وہ سائیکل ہے جو پارسی سیٹھ نے جھبا کو تحفے میں دی تھی اور یہی سائیکل دونوں کے درمیان رقابت اور منافرت کا باعث ہے۔

زندہ——: کا کردار سمیر مضبوط قوت ارادی کا مالک ہے۔ وہ منفعل نہیں، بہت ہی مضبوط اور مثبت کردار ہے۔ سمیر کی زندگی کا اپنا ایک فلسفہ ہے۔ وہ کسی بھی صورت اپنی انا اور قوت ارادی کو مرنے نہیں دینا چاہتا۔ وہ مسلسل موج حوادث سے لڑتا جاتا ہے۔ اس کے اندر مدافعتی اور مزاحمتی قوت ہے۔ اس کا تصور ہے کہ ''میرے انگ مجھ سے ہیں۔ میں اپنے انگوں سے نہیں۔'' وہ کئی حادثات اور سانحات سے گزرتا ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر اس کے باپ کی حالت غیر ہو جاتی ہے۔ وہ اپنے بیٹے کی خوشی کے لیے ہر طرح کی آسائشیں مہیا کرتا ہے۔ مگر بیٹے کی انا اور قوت ارادی ایسی آسائشوں کو قبول نہیں کرتی۔ اس کی شادی ایک لڑکی سے کرادی جاتی ہے تاکہ لڑکے کی دیکھ بھال اچھی طرح ہو سکے مگر جس رات شادی ہوتی ہے سمیر خودکشی کر لیتا ہے۔ کیونکہ وہ ایسی زندگی نہیں جینا چاہتا جس میں اس کی خودداری کی موت ہو جائے۔ دراصل خودی ہی اس کی زندگی ہے اور جب خودی مجروح ہو جائے تو زندہ رہنے کا کوئی مطلب نہیں رہ جاتا۔

ہاتھ پیلے کردو——: منطقی ترتیب و تکنیک دور تسلسل سے بنی گئی یہ ایک کہانی ہے۔ اس کہانی کا ایک دائروی تسلسل ہے یعنی اس کہانی میں ماں جس طرح کے واقعات، حالات اور ذہنی کیفیات سے

Scanned by CamScanner

دو چار ہوتی ہے بعینہٖ وہی سچویشن بیٹی کے ساتھ بھی پیش آتی ہے۔ کہانی کا کردار مالتی ایک جوان لڑکی ہے جو رام ناتھ ڈرائیور سے پیار کرتی ہے، وہ ڈرائیور جب بھی ہارن بجاتا ہے تو مالتی مرلی کی آواز سن کر اپنے کرشن کے پاس رادھا بن کر آجاتی ہے اور اس کی بانہوں اور نرم آغوش میں لپٹ جاتی ہے۔ یہ اس وقت ہوتا جب ہائی ٹائیڈ آتا وہ ہائی ٹائیڈ کا انتظار کرتی رہتی۔ ایک دن جب اسی طرح ہارن کی آواز پر وہ شیلا کا بہانہ بنا کر اپنے کرشن رام ناتھ کے پاس جاتی ہے تو ماں اسے رنگے ہاتھوں پکڑ لیتی ہے اور بات اس کے ہاتھ پیلے کرنے کی شروع ہو جاتی ہے۔ اسی دوران رام ناتھ کو لوگ مار دیتے ہیں۔ اس کی شادی بشن داس سے ہو جاتی ہے جس سے اب مالتی کے تین بچے ہیں۔ سب سے بڑی لڑکی لتا ہے جو اسکول میں پڑھتی ہے اور شاید کسی لڑکے سے محبت کرتی ہے۔ ایک دن جب ماں ہارن کی آواز سنتی ہے تو وہ سٹپٹا جاتی ہے۔ یہ آواز اسے ماضی میں لے جاتی ہے اور وہ سوچنے لگتی ہے کہ کہیں یہ اس کی بیٹی لتا کے لیے اس کے کرشن کی بانسری تو نہیں۔ پھر کہیں وہی واقعہ نہ ہو جائے جو اس کے ساتھ پیش آیا تھا۔ اس لیے وہ اپنے شوہر سے کہتی ہے کہ لڑکی جوان ہو گئی ہے۔ اب اس کے ہاتھ پیلے کر دو۔ یعنی اس کہانی کا حال ماضی سے مربوط ہے اور یہ ماضی اور حال کے درمیان ایک ایسے تسلسل کو پیش کرتی ہے جو کسی کی زندگی میں کسی بھی وقت پیش آ سکتا ہے۔ اس کہانی میں 'ہائی ٹائیڈ' کی تمثیل کہانی کی پراسرار تہوں کو اجاگر کرتی ہے۔ گلزار نے ہائی ٹائیڈ کا منظر یوں کھینچا ہے:

> ''رات میں جب ہائی ٹائیڈ آتی تو کھاڑی بھر بھر جاتی۔ سمندر کی لہروں کا شور دھیرے دھیرے نزدیک آنے لگتا۔ لہریں اس کے اوپر سے پھلانگنے لگتیں۔ چار پائی پانی میں تیرنے لگتی۔ تیرتے تیرتے کئی سمندر پار کر جاتی اور کئی انجانے جزیروں کو چھو آتی۔ آنکھ کھلتی تو وہی چولھا چوکا، باپو، حقہ اور ماں، وہ بے من، بے مقصد اپنے کام میں لگی رہتی اور پھر سے ہائی ٹائیڈ کا انتظار کرنے لگتی۔''

ہائی ٹائیڈ دراصل ایک تمثیلی کنایہ ہے۔ اس کا انسان کے باطن سے بھی تعلق ہے جو انسان کے اندر مدوجزر کی کیفیت پیدا کرتا ہے۔ یہ ہائی ٹائیڈ ہر کسی کی زندگی میں آتا ہے۔ جوانی دراصل ہائی ٹائیڈ کی طرح ہوتی ہے جس میں بے قابو جذبات کی لہریں رواں ہو جاتی ہیں۔ اس کہانی کا عنوان 'ہائی ٹائیڈ' بھی ہو سکتا ہے۔

کاغذ کی ٹوپی:— محبت اور یادوں کے لطیف لمس کی کہانی ہے یہ۔ بچپن کی معصوم شوخیوں اور شرارتوں کے نرم و نازک دھاگوں سے بنی گئی یہ کہانی بہت دلچسپ ہے۔ ایک فنکار کے معصومانہ تحیر

Scanned by CamScanner

اور تحیر کی معصومیت کو اجاگر کرتی اس کہانی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان چاہے بوڑھا ہو جائے مگر بچپن کی یادیں، شرارتیں، شوخیاں ذہن سے کبھی محو نہیں ہوتیں۔ زندگی کا سفر طے کرتے کرتے کسی نہ کسی موڑ پہ بچپن کی یادیں لوٹ آتی ہیں اور کبھی کبھی بچپن کی شرارتیں زندگی کی حقیقت بھی بن جاتی ہیں۔ اس کہانی میں منی ایک ایسا کیریکٹر ہے جو بچپن میں ہمیشہ دلہن بنا کرتی تھی۔ کہانی کا دوسرا کردار جب کبھی اسے چھیڑتا تو وہ کہتی کہ تم دلہا بننے کے قابل نہیں ہو۔ ایک دن جب وہ کاغذ کی ٹوپی بناتا ہے تو منی اس کی دلہن بننے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ زندگی کے بہت سارے لمحے طے کرنے کے بعد یہی منی جب اس کردار سے ملتی ہے تو پھر وہی شوخیاں لوٹ آتی ہیں، ناراضگی بھی ہوتی ہے اور محبتیں بھی اور ایک دن عجیب سا واقعہ رونما ہوتا ہے کہ منی کاغذ کی ٹوپی بنانے لگتی ہے۔ کاغذ کی ٹوپی اس کا واضح اشارہ ہے کہ وہ اسے اپنے دلہا کے روپ میں چننا چاہتی ہے۔ محبت کی یہ عجب پُراثر کہانی ہے۔ بچپن کے ایک رمزیاتی واقعے سے حال کی تشکیل اور مستقبل کی تعمیر کا ایک خوش آئند اشاریہ ہے اس کہانی میں۔ بچپن کے معصوم جذبوں کے شعلوں کا شجر بننے کی یہ داستان بڑی پُرلطف ہے اور دلچسپ بھی۔

حساب کتاب—: ایک سماجی مسئلے سے جڑی ہوئی کہانی ہے۔ ایک پڑھی لکھی بی۔ اے پاس لڑکی کو بھی شادی میں کیسی کیسی دقتیں پیش آتی ہیں اور جہیز کے ناسور نے سماج کو کس طرح جکڑ لیا ہے، یہ اہم ترین مسئلہ ہی اس کہانی کی موضوعاتی اساس ہے۔ جہیز نہ بھی لیا جائے تب بھی جہیز کی شکلیں برقرار رہتی ہیں یعنی معاشرہ جہیز کی لعنت سے کسی بھی طور پہ پاک صاف نہیں ہے۔ حساب کتاب عنوان ظاہر کرتا ہے کہ جہیز کی شکل بدل جائے مگر ماہیت تبدیل نہیں ہوتی۔ نوعیت بدل جائے مگر حقیقت نہیں بدلتی۔ جہیز صرف سونے اور زیورات کا نام نہیں ہے بلکہ کچھ اور چیزیں بھی ہیں جو جہیز کے زمرے میں آتی ہیں۔

آگ—: معنیاتی رمز کی ایک ایسی کہانی ہے جس کی کئی سطحیں اور تہیں ہو سکتی ہیں۔ یہ کہانی انسانی سوچوں کے ارتقائی سفر کی ہے۔ اس میں انسانی تفکر کے اولین نقوش اور انسانی تہذیب کے ابتدائی مظاہر کی بازیافت کی گئی ہے۔ قدرت اور فطرت کے مظاہر اور مناظر کو دیکھ کر انسان کے ذہن میں ابتدائی نوعیت کے جو سوالات اٹھے ہوں گے، وہ کیسے ہوں گے، اس کی کچھ شکلیں اس کہانی میں موجود ہیں۔ انسانی ابصار کے مختلف مدارج سے گزرتی یہ کہانی بتاتی ہے کہ اس وقت جب علم کی روشنی نہیں تھی، انسان حیوان کی مانند تھا۔ اس وقت بھی ذہنوں میں سوالات اٹھتے تھے۔ انسانی ذہن اس

Scanned by CamScanner

وقت بھی تجسس آشنا تھا۔ جستجو اور تجسس کا جذبہ انسان میں بہت پہلے سے موجود رہا ہے۔ اس کی ایک مثال سوچنے والا اولین انسان بابو تھا جو ہمیشہ کائنات کے آثار میں اسرار تلاش کرتا اور اس کے مفاہیم کی جستجو کرتا رہتا۔ کائناتی اسرار کی معنویت تلاش کرنے میں محو رہتا۔ عجیب وغریب طرح کے سوالات اس کے ذہن میں اٹھتے۔ مثلاً صرف عورت ہی بچے کیوں جنتی ہے۔ مرد کیوں نہیں جنتا؟ بارش کیوں ہوتی ہے، شاید سب دیوتا مل کر آسمان میں موتتے ہیں تو بارش ہوتی ہے۔ ہر شخص کی تفہیم کا اپنا ایک زاویہ ہوتا ہے۔ چاہے منطقی ہو یا غیر منطقی۔ بابو بھی کائنات کے اسرار کی تفہیم میں اپنے منطقی ذہن کا استعمال کرتا تھا۔ بابو کے اندر دھن تھی، لگن تھی، کسی چیز پر قابو پانے کی قوت ارادی تھی۔ چنانچہ اپنے تجسس کی تشنگی بجھانے کے اس سفر میں اس نے کئی طرح کے معرکے سر کیے اور اپنے قبیلے والوں کی نظر میں سرخرو ہوا۔ اس نے اپنے عزم بالجزم سے ہاتھی جیسے ہیبت ناک جانور سے دوستی کر لی اور اسے پالتو بنالیا۔ اس واقعے کے بعد اس کے تجسس کے قدم اور آگے بڑھنے لگے۔ اس کا حوصلہ اور بڑھا۔ اب ایک دن جو اس نے ایک عجیب سا جانور دیکھا جو سوکھے پیڑ کو کھائے جا رہا تھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اس کا تجسس بڑھا اور وہ اس جانور پر قابو پانے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ یہ جانور آگ تھا۔ اس نے اس آگ کے رمز کو سمجھ لیا۔ ایک دن جب بارش ہوئی تو آگ کا جسم جل کر راکھ ہو گیا اور اس سے دھواں اٹھنے لگا جو اوپر کی طرف بڑھ رہا تھا۔ قبیلے والوں نے سوچا کہ مرنے کے بعد شاید آدمی کی جان بھی اوپر جاتی ہے۔ اس آگ اور اس کی موت نے قبیلے والوں کے ذہنوں کے کئی دریچے کھول دیے اور وہ سوچنے لگے کہ آدمی مر کر کہاں جاتا ہے۔ آگ دراصل اس کہانی میں ایک رمز ہے۔ اسی آگ سے جڑی ہوئی ہے انسان کی ابتدا اور انتہا کی کہانی اور یہ دراصل انسان کی ابتدائی سوچوں کی بازیافت ہے۔ اس کہانی کی قرأت ذرا مختلف سطح پر کی جائے تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ آگ جو کبھی انسانوں کے تحفظ کا ذریعہ تھی، جنگلی جانوروں سے بچاتی تھی، روشنی عطا کرتی تھی، بدلتے زمانے کے ساتھ اس آگ کی معنویت بھی بدل گئی ہے اور وہ آگ اب عدم تحفظ، خوف اور تاریکی کا استعارہ بن گئی ہے۔

جنگل نامہ ——: جانوروں کے جذبات کا بہت ہی دلچسپ اور خوبصورت بیانیہ ہے۔ انسان اور جنگل کی تہذیب کے مابین قربتوں اور فاصلوں کا ایک ایسا منظرنامہ جسے پڑھ کر انسانی تہذیب سے وحشت اور جنگلی تہذیب سے عطوفت پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانوں کی بستی اور بڑھتی ہوئی آبادی سے جانوروں کی وحشت اور ان میں پھیلتی دہشت کی کوکھ سے اس کہانی نے جنم لیا ہے۔ جانوروں کی

Scanned by CamScanner

زبانی انسانی وحشت کی یہ کہانی بہت ہی پراثر ہے۔ اس کہانی کے سیاق وسباق میں دیکھا جائے تو انسان بنیادی طور پر غاصب نظر آتا ہے جس نے جانوروں کو زمین کی ملکیت سے بے دخل کر دیا اور اس کی زمین پہ قابض ہو گئے۔ انسان کی بے گھری پر تو بڑے بڑے افسانے لکھے گئے ہیں۔ بہت سے ناول بھی منظر عام پر آئے ہیں اور شاعری کا تو ایک بڑا ذخیرہ ہے۔ مگر جانوروں کی بے گھری ایک ایسا موضوع ہے جس پر بہت کم لوگوں نے قلم اٹھایا ہوگا۔ یہ کہانی دراصل جانوروں کی بے گھری کی ہی کہانی ہے۔ اس میں جانوروں کی جنگ آزادی، جنگی حکمت عملی، ان کی وحدت واخوت، بھائی چارگی، محبت، خلوص، ایثار کا بیان ہے۔ کہانی کے اختتام میں ایک پیغام مضمر ہے کہ "جنگل کی زندگی انسان کی زندگی کی طرح ہی قیمتی ہے۔ اسے بچانا ہمارا فرض ہے۔" اس کہانی میں بنی نوع انسان اور آدم زاد کے لیے بہت بڑا سبق ہے۔ اس میں انسانی اقتدار، انسانی طرز حکومت اور انسانی نظام عدل پر بھی گہرا طنز ہے۔ انسان اقتدار کی ہوس میں اپنے بھائی اور رشتے داروں تک کو موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ انسانی اقتدار کی تاریخ ایسی خونریزیوں سے بھری پڑی ہے۔ راجاؤں، مہاراجاؤں کے مظالم کے قصے کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ رعایا پر راجہ کے ظلم و جبر کی داستان کسی سے مخفی نہیں ہے۔ مگر جنگل کا راج انسانی خودغرضی، مکاری، منافقت اور ہوس سے عاری ہے۔ انسانی تہذیب کی کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں:

"جانور تو ابھی ایک جنگل میں رہ لیتے ہیں لیکن انسان ایک ملک میں بھی رہ نہیں پاتا اور اکثر اس کے بٹوارے کرنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک کنبے میں بھی لڑائی جھگڑا کر کے گھر کا بٹوارہ کر لیتا ہے۔

... اچانک چیتا خون میں لت پت ایک انسان کی لاش لے کر وہاں پہنچا۔ سب نے اسے نفرت سے دیکھا۔ شاید اس نے بدلہ لیا تھا۔ لیکن چیتے نے بتایا... اس انسان کو کسی انسان نے مار کر ندی میں پھینک دیا تھا۔ میں تو یہی دکھانے لایا ہوں کہ جو خود اپنی ذات پر رحم نہیں کرتا وہ ہم پر کیا رحم کرے گا۔

... مالک مالک کہہ کے بات مت کرو۔ ہاتھی نے چوہے کو ڈانٹ دیا۔ یہ عادت تم نے انسانوں سے سیکھی ہے۔ ہم طاقت میں بڑے ہیں لیکن تمہارے مالک نہیں ہیں۔ تم قد میں ہم سے تھوڑے چھوٹے ہو لیکن ہم سے زیادہ کرتب جانتے ہو۔"

جنگل کا راجہ شیر جب چیتے کو انسانی بستی میں محصور دیکھتا ہے تو اپنی جان کی بازی لگا کر اسے

Scanned by CamScanner

بچانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کوشش میں وہ خطرات سے کھیلتا ہے۔ کیا انسانی راج میں ایسا ہوتا ہے۔ یہ ایک سوالیہ نشان ہے؟ شیر جنگل کا راجہ اس لیے ہے کہ وہ اپنی رعیت کے جان و مال کی حفاظت کے لیے اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے۔ مگر ہمارا مہذب انسانی معاشرہ اور معاشرے کا اقتدار پرست طبقہ اس خوبی سے محروم ہے۔ جنگل کی تہذیب دراصل انسانی تہذیب سے بہت آگے ہے اور انسانی تہذیب ابھی جنگل کی تہذیب سے بہت پیچھے ہے۔ یہی اس کہانی کا مرکزی خیال ہے۔ وائلڈ لائف پر اردو میں بہت کم کہانیاں لکھی گئی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ گلزار کی یہ کہانی اس نوعیت کی شاید پہلی اور اہم ترین کہانی ہے۔

(۳)

گلزار ایک انتہائی حساس تخلیقی ذہن رکھتے ہیں اور یہ ذہن تجسس آشنا بھی ہے اور جستجو آمیز بھی۔ ان کے تخلیقی عمل کا دائرہ لامحدود ہے۔ وہ جہاں موضوعاتی سطح پر تنوعات کو پیش نظر رکھتے ہیں وہیں کردار نگاری میں وہی تخلیقی تنوع کا رویہ اپناتے ہیں۔ کیونکہ کوئی بھی آرٹ ہو، تنوع چاہتا ہے، یکسانیت نہیں، آرٹ کے لیے ایک ہی چہرہ نہیں، کئی چہرے درکار ہوتے ہیں۔ آرٹ کے تخلیقی تجربے بدلتے رہتے ہیں۔ وہی آرٹ زندہ رہتا ہے جس میں varieties ہوں۔ گلزار نے اپنی کہانی ''مائیکل اینجلو'' میں اسی تجرباتی تنوع کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مائیکل اینجلو کو آفاقی شہرت اس لیے ملی کہ اس نے اپنے آرٹ میں تنوع کو برتا اور جب یہ دیکھا کہ روم میں چہرے نہیں ملتے، چہروں پر کردار نہیں ملتے، سب ایک ہی سے لگتے ہیں تو وہ نئے چہروں اور کرداروں کی تلاش میں نکل پڑا، اور اس کے اندر ایک تخلیقی جنون بھی تھا اس لیے وہ مصوری کی دنیا میں امر ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ گلزار صاحب نے کہانی کے آرٹ میں بھی مائیکل اینجلو کے تجربوں کو ہی دہرایا ہے اور انہوں نے مختلف کردار خلق کیے ہیں اور ہر کردار اپنی تمام تر ہیئت اور معنویت کے ساتھ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ چاہتے تو مافوق الفطرت، اساطیری کردار کا سہارا بھی لے سکتے تھے مگر انہوں نے جس عہد، جس سماج اور جس معاشرے کی کہانیاں لکھی ہیں۔ ان کے لیے یہ کردار unifit ہوتے۔ عموماً نام نہاد بڑے تخلیق کاروں کے کردار بھی بڑے ہوتے ہیں۔ ان کے کردار ''کوہ قاف'' سے آتے ہیں مگر گلزار کا انفراد و اختصاص یہ ہے کہ ان کے کردار گلی محلوں میں گھومتے پھرتے نظر آجاتے ہیں۔ گلزار نے حقیقی کرداروں کو چنا ہے، زندہ جیتے جاگتے کردار جو آسانی سے کہیں بھی کسی بھی موڑ پہ مل سکتے ہیں۔

Scanned by CamScanner

بس دیکھنے والی نظر چاہیے — جوہری کی آنکھ — اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کہانی کسی گلی کے نکڑ اور کسی کمرے کے کونے میں کھڑی ہوتی ہے۔ مگر ہم اسے سات سمندر پار کسی دوسرے دیش میں تلاش کرتے ہیں۔ گلزار نے ایسا نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے اطراف و اکناف سے کہانیاں لی ہیں اور کردار چنے ہیں۔ معمولی معمولی واقعات بھی ان کے یہاں کہانی بننے کی قوت رکھتے ہیں اور انہوں نے موضوعات میں بھی تنوع کو برتا ہے۔ گلزار نے سماجی، سیاسی، معاشرتی، عمرانیاتی، بشریاتی، ماحولیاتی، نفسیاتی اور دیگر اہم موضوعات و مسائل پر اپنی کہانی کے ذریعے روشنی ڈالی ہے اور المیہ تقسیم اور فسادات پر انہوں نے جس نوع کے افسانے لکھے ہیں، اس سے ان کی تخلیقی قامت اور ذہنی بلندی کا اندازہ ہوتا ہے۔ المیہ تقسیم پر یوں تو اردو ہندی پنجابی میں بہت سارے افسانے لکھے گئے ہیں۔ بالخصوص ان لوگوں نے بہت اچھے اور متاثر کن افسانے لکھے ہیں جو اس سانحے سے گزرے ہیں۔ کرتار سنگھ دگل (کلثوم، نیا گھر) موہن راکیش (ملبے کا رقبہ) احمد ندیم قاسمی (پرمیشور سنگھ) ممتاز مفتی (ثمینہ) اشفاق احمد (گڈریا) رام لعل (ایک شہری پاکستان کا) کرشن چندر (ہم وحشی ہیں) بھیشم ساہنی (ہم امرتسر پہنچے) — یہ چند ایسی کہانیاں ہیں جو المیہ تقسیم پر لکھی گئی ہیں اور گلزار صاحب کی کہانی 'تقسیم' بھی انہیں کہانیوں میں ایک اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ فسادات پر یوں تو ڈھیر سارے افسانے لکھے گئے ہیں۔ منٹو اور دیگر لوگوں کے افسانے اس موضوع پر کافی مشہور بھی ہیں مگر گلزار کی کہانی 'خوف' اور 'راوی پار' ایسے افسانے ہیں جن کی معنویت ان افسانوں سے مختلف ہے۔ ان کہانیوں میں ان کا انسانیت پسندانہ تناظر اُبھرتا ہے اور یہی انسانیت پسندی ہے جو ان کی کہانیوں کو امتیاز عطا کرتی ہے۔ انہوں نے عورت مرد کے رشتے پر بھی اچھی کہانیاں لکھی ہیں اور اس میں عورت مرد کو ایک مساوی اور متوازی حیثیت میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے نئے یگ کے مرد عورت کے رشتوں پر بہت اچھی کہانیاں دی ہیں۔ ''ایک چابی'' اور ''مرد'' ایسی ہی کہانیاں ہیں جس میں انہوں نے مرد عورت کے بنیادی جذبوں کو ہی اپنا تخلیقی اور موضوعاتی محور بنایا ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ آج کے زمانے کی بدلتی عورت social mobility, liberty, equality چاہتی ہے۔ اسے 'پتی پرمیشور' نہیں ایک 'ہم سفر' چاہیے۔ اس نوعیت کی کہانیوں میں عورت مرد کی جنسی سماجی اخلاقیات سے انحراف لیے ہوئے نظر آتی ہے۔ مرد عورت کی ثقافتی تفریق کو انہوں نے بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ محبت کی مینا فزکس اور اور معاشرے کی سوشیالوجی کو انہوں نے اپنے فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔

Scanned by CamScanner

دراصل گلزار ادب کو سماجی تناظر میں دیکھتے ہیں اور ادب کو سماج کا آئینہ دار مانتے ہیں۔ اس لیے انہوں نے اپنی کہانیوں میں وہی کردار چنے ہیں، جو ہمارے سماج کا حصہ ہیں۔ جن سے سماج کا اچھا یا برا منظر نامہ تشکیل پاتا ہے۔ گلزار نے حقیقت پسندی کی افسانوی تکنیک کو برتا ہے اور سماج کے حالات، واقعات، سانحات کو اپنے کرداروں کے ذریعہ پیش کیا ہے اور کرداروں کی داخلی، ذہنی، جذباتی، احساساتی کیفیت اور باطنی مد و جزر کو بڑی ہی فن کاری سے پیش کیا ہے۔ گلزار کی کسی کہانی میں کوئی مغلق، مبہم بے چیدہ کردار نہیں ہے جو انسانی عقل و فہم سے بالاتر ہو—

فکشن میں زبان کا مسئلہ بھی بڑا اہم ہوتا ہے۔ گلزار کی زبان خوب صورت ہے اور ترسیلی بھی۔ انہوں نے کہانی میں علامات، تشبیہات اور استعارات کا استعمال نہیں کیا ہے بلکہ بڑی وضاحت اور صراحت کے ساتھ کہانیاں لکھی ہیں تا کہ کہانی بوجھل پن کی شکار ہو کر قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ یہ عام فہم، سیدھی سادی زبان ہے۔ وہ چاہتے تو شاعرانہ زبان بھی استعمال کر سکتے تھے جو کہ رچرڈ کی زبان میں emotive language کی supreme form ہوتی ہے۔ مگر گلزار نے ایسا نہیں کیا۔ بلکہ اس طرح کا تاثر دیا ہے جیسے وہ کہانی لکھ نہیں رہے ہوں بلکہ سنا رہے ہوں اور اس لیے اس میں لاشعوری کیفیات، لاشعوری زبان، منتشر خیالات، ساری چیزیں آ گئی ہیں۔ جن سے ان کی کہانی کا تناظر دوسرے کہانی کاروں سے مختلف ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں پڑھتے ہوئے باطن میں جذبوں کے ساتھ ساتھ بہت سارے آنسو اور درد بھی شامل ہو جاتے ہیں اور یہی درد آنسو، کہانیوں کے ساتھ ساتھ بڑھتے بڑھتے سمندر بن جاتے ہیں۔ یہی گلزار کا فنی، تخلیقی اعجاز ہے اور یہی ان کی ساحری بھی۔

Scanned by CamScanner

His short stories are like bodies of flesh an blood. **Gulzar**, among the outstandin writers of Urdu short stories, creates ther like God creates men and women. Every one these bodies has its own entity. If one is delicat another is full of passion, there are cool ones an there are those burning with the fire of anger an agony, some breathe human tragedy, others open revolt and reject injsutice. Gulzar creates thes living things with the marriage of word and sensitiv perception.

It is amazing, what rich metaphors h searches out and weaves into his stories of life an death. The present collection, a prestigio publication of the literary publishing house - ***'Isteara'*** has ***'Raavi Paar'*** or across the Raavi, as i theme story. Here the river Raavi, flowing betwe India and Pakistan, is the metaphor for one of th most traumatic happening of the Indian su continent, the partition of India, which gave birth several tales of terror, tearful tragedy and stunni trauma. Darshan Singh, the central character of th story is like a sinking human soul caught up in sw of tragedy and adverse circumstance. The land his birth was being cut into two, streams of dea and blood were flooding its landscape. Even t vicious sky was raining blood. Darshan Singh w uprooted and compelled to leave for refuge acro Raavi with his wife and newly born twins. The train India was packed with men and women. But he m escape across Raavi. He clambered up the roof the train with his wife and twins. The train rais hope and excitement in the heart of the refugees cities close India passed by. And at this juncture, o of the twins stopped breathing just when the tr was crossing the Raavi, fellow passengers advis Darshan Singh to throw away the dead child into river. He threw away one of the twins into the ri and then turned to look after the other one. He s

Cont

ISTEARA
PUBLICATIONS
248, Ghaffar Apts, Isteara Lane,
Ghaffar Manzil Extn. Jamia Nagar,
New Delhi-110025
Tel. : 6318126

Scanned by CamScanner